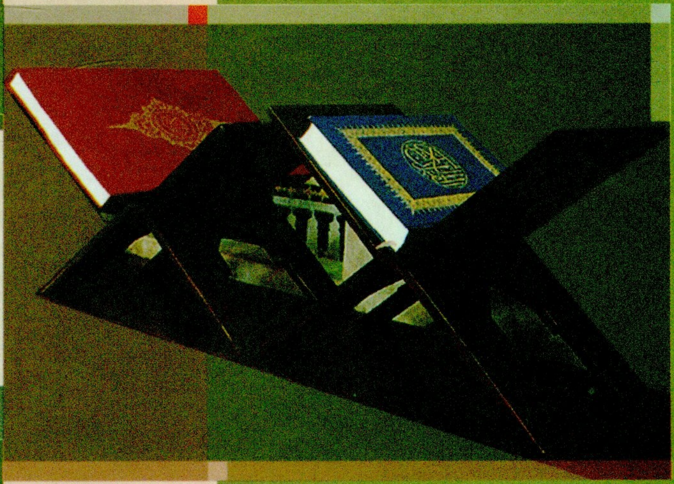
خُطباتِ قرآن



ڈاکٹر ذاکر نائیک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبات قرآن

مکمل اور مستند ترجمہ کے ساتھ

بائبل اور قرآن

قرآن اور سائنس

کیا قرآن کلامِ خداوندی ہے؟

مترجم

سیّد امتیاز احمد

www.KitaboSunnat.com

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

۱۴۲۹ ہجری ۲۰۰۸ء

کتاب : خطبات قرآن

مصنف : ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم : سید امتیاز احمد

اہتمام : دار النوادر، لاہور

مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور

صفحات : ۲۹۶

قیمت : ۲۰۰ روپے

ڈسٹری بیوٹرز

فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 7320318 فیکس: 7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

ترتیب

حصہ اوّل

حصہ دوم

☆..........☆..........☆

خطاب

ڈاکٹر ولیم کیمپبل

سب سے پہلے تو میں ڈاکٹر ذاکر نائیک کو خوش آمدید کہنا چاہوں گا کہ وہ اتنی دور تشریف لائے۔ میں سہیل احمد، محمد نائیک اور منتظمہ کمیٹی کے اراکین کو بھی خوش آمدید کہتا ہوں۔ آج کے مکالمے کو ''The Ultimate Dialogue'' کا عنوان دینا تو خیر مبالغہ ہوگا، لیکن بات یہ ہے کہ اس طرح ذرا مشہوری اچھی ہو جاتی ہے۔ میں جملہ حاضرین کو بھی اس تقریب میں خوش آمدید کہتا ہوں۔

میں ''یہوواہ'' کے نام پر خوش آمدید کہتا ہوں، جو ہمارا عظیم خالق ہے اور ہم سب سے محبت کرتا ہے۔

سب سے پہلے میں ''الفاظ'' کے بارے میں گفتگو کرنا چاہوں گا۔ آج ہم سب یہاں الفاظ ہی کے بارے میں بات کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ بائبل کے الفاظ کے بارے میں اور قرآن کے الفاظ کے بارے میں......

جدید علم لسانیات کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ کسی لفظ، فقرے یا جملے کے معانی وہی ہوتے ہیں جو بولنے والا مراد لیتا ہے یا جو سننے والا فرد یا افراد مراد لیتے ہیں۔

گویا قرآن کے الفاظ کے معانی وہی ہوں گے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم مراد لیتے تھے یا ان کی بات سننے والے مراد لیتے تھے۔ بائبل کے معاملے میں ''الفاظ'' کے معنی وہی ہوں گے جو حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے نزدیک تھے یا ان کے مخاطبین مراد لیتے تھے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے اور پرکھنے کے لیے پوری بائبل اور پورا قرآن دونوں کتب

ایک تناظر فراہم کرتے ہیں، مزید برآں اس دور کے ادب اور شاعری سے بھی مدد ملتی ہے۔ یعنی انجیل کے معاملے میں پہلی صدی عیسوی کا ادب اور قرآن کے معاملے میں پہلی صدی ہجری کا ادب اور شاعری ہماری مدد کرتے ہیں۔

اگر ہم حقیقت کی پیروی کرنا چاہتے ہیں، اگر ہم سچائی کے متلاشی ہیں تو ہمیں الفاظ کو نئے معانی پہنانے سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر ہم حقیقت کی تلاش میں سنجیدہ ہیں تو کسی ''جائز غلط بیانی'' کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

میں ایک مثال کی مدد سے اپنی بات واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میرے پاس دو ڈکشنریاں ہیں، ایک کا سنہ اشاعت ۱۹۵۱ء ہے اور دوسری کا ۱۹۹۱ء۔ یہ دونوں لغات میرے گھر میں موجود ہیں۔ میں ان دونوں میں ایک لفظ ''Pig'' کے معانی دیکھتا ہوں۔

پہلا معنی ہے ''کسی بھی جنس کا جوان خنزیر'' اور یہ معنی دونوں لغات میں موجود ہے۔

دوسرا معنی ''کسی بھی نوع کا جنگلی یا پالا ہوا خنزیر'' بھی دونوں جگہ موجود ہے۔

تیسرا معنی ''خنزیر کا گوشت'' بھی دونوں لغات میں موجود ہے۔

چوتھے معانی ''سور جیسی عادات والا شخص یا بہت زیادہ کھانے والا شخص'' بھی دونوں لغات میں پائے جاتے ہیں۔

لیکن آخر میں اس لفظ کے ایک نیا معنی بھی موجود ہے جو صرف نئی چھپنے والی لغت میں ہی موجود ہے۔ اور وہ ہے ''پولیس والا''۔ گویا جدید لغت کے مطابق یہ لفظ پولیس والوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ تورات میں کہا گیا..... "You can not eat Pigs."

تو اگر میں اس جملے کا یہ معنی مراد لوں کہ یہاں Pig سے مراد پولیس والا ہے اور یہ کہ یہاں پولیس والوں کا گوشت کھانے سے منع کیا جا رہا ہے تو کیا یہ درست ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔ اسی طرح قرآن میں بھی لحم خنزیر کھانے سے منع کیا گیا ہے، کیا وہاں میں یہ کہہ

سکتا ہوں کہ Pig سے مراد ''پولیس والا'' ہے؟ نہیں کیوں کہ ایسا کہنا غلط ہوگا، احمقانہ ہوگا بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ یہ ایک سفید جھوٹ ہوگا۔ کیوں کہ محمد ﷺ یا موسیٰ علیہ السلام اس لفظ سے کبھی بھی ''پولیس والا'' مراد نہیں لے سکتے تھے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں الفاظ کے نئے معانی مراد لینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ انجیل کے معاملے میں الفاظ کے وہی معانی سامنے رکھنے چاہئیں جو پہلی صدی عیسوی میں تھے۔ اسی طرح قرآن کے الفاظ کو بھی انھی معانی میں استعمال ہونا چاہیے جن معانی میں یہ پہلی صدی ہجری کے دوران میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن ''علم جنینیات'' Embryology کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنین کے مختلف مراحل میں ارتقا کا نظریہ ایک جدید نظریہ ہے اور یہ کہ قرآن ہمیں ان مراحل کی خبر دیتا ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مور اپنے کتابچے ''Highlights of Human Embryology'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ حقیقت کہ جنین کا ارتقا مختلف مراحل میں ہوتا ہے، پندرھویں صدی عیسوی تک واضح نہیں ہوئی تھی۔''

ہم اس دعوے کو پرکھنے کے لیے ایک تو قرآن میں استعمال ہونے والے عربی لفظ کا تجزیہ کریں گے اور دوسرا ہم قرآن سے وابستہ تاریخی حالات کا جائزہ لیں گے۔ ہم شروع کرتے ہیں عربی کے لفظ ''علقہ'' سے جو قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ واحد عَلَقَةٌ اور جمع ''علق'' دونوں صورتوں میں چھ بار استعمال ہوا ہے۔

سورۂ قیامۃ میں ہم پڑھتے ہیں:

﴿أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ۝ أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ ۝﴾

[القیامۃ: ۳۶۔۳۹]

’’کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔‘‘

اسی طرح سورۂ مومن میں تحریر ہے:

﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝﴾

[المؤمن: ٦٧]

’’وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر وہ تمھیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے، پھر تمھیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ، پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو اور تم میں سے کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو۔‘‘

سورۂ حج میں کہا گیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِى الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ط﴾

[الحج: ٥]

’’لوگو! اگر تمھیں زندگی بعدِ موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم

ہو کہ ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں، ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔''

اور پھر سورۂ مومنون میں یہ بیان بھی موجود ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝﴾ [المومنون: ۱۴-۱۲]

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔''

اور یہاں وہ مراحل ہمارے سامنے آتے ہیں جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں، یہ مراحل مندرجہ ذیل ہیں:

نُطْفَةً	نطفہ
عَلَقَةً	لوتھڑا
مُضْغَةً	بوٹی

عِظٰمًا		ہڈیاں

اور آخری مرحلہ ہڈیوں پر گوشت چڑھنے کا۔

گزشتہ سو سال کے عرصے میں لفظ ''علقہ'' کے بہت سے تراجم ہوئے ہیں، دس ترجمے یہاں موجود ہیں۔ تین فرانسیسی ترجمے، پانچ انگریزی ترجمے، ایک انڈونیشین زبان میں اور ایک پارسی زبان میں۔ ان تراجم میں لفظ علقہ کا ترجمہ لوتھڑا یا خون کا لوتھڑا یا جونک کی طرح کا لوتھڑا کیا گیا ہے۔

ان تراجم سے ہر وہ قاری جس نے انسانی افزائش نسل کے عمل کا مطالعہ کر رکھا ہے، اندازہ کر سکتا ہے کہ جنین کی تشکیل کے دوران ایسا کوئی مرحلہ نہیں ہوتا جہاں جنین کی صورت لوتھڑے کی مانند ہو۔ لہٰذا یہ ایک نہایت اہم سائنسی مسئلہ ہے۔ اس لفظ کو اگر آپ لغت میں دیکھیں تو اس کے معنی صرف لوتھڑا یا جونک ہو سکتے ہیں۔ شمالی افریقہ میں یہ لفظ انہی معنوں میں آج بھی مستعمل ہے۔ میرے پاس ایسے مریض آتے رہے ہیں جو یہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ایسی خواتین بھی آتی رہیں جو کہتی تھیں کہ حیض کا آغاز وقت پر نہیں ہوا۔ میں انھیں کہتا تھا کہ میں آپ کو حیض جاری کرنے والی ادویات نہیں دے سکتا کیوں کہ میرے خیال میں یہ حمل ہے۔

وہ کہتی تھیں کہ نہیں ''ابھی خون ہی ہے''۔ یعنی وہ اس قرآنی تصور کو سمجھ رہی تھیں۔ آخر میں ہمیں قرآن کی سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ جو (حضرت) محمد ﷺ پر مکہ میں نازل ہوئیں۔ یہ آیات قرآن کی سورۃ نمبر ۹۶ میں موجود ہیں۔ اس سورۃ کا نام ہی سورۃ العلق ہے۔ یعنی وہ لفظ جس کا ہم یہاں مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سورۃ میں کہا گیا ہے:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝﴾

[العلق: ۱-۲]

''پڑھو (اے نبی ﷺ!) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔
جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔''

لفظ کی اس صورت یعنی ''علق'' کے دیگر معانی بھی ممکن ہیں۔ مثلاً چپکنا، لٹکنا، چمٹنا وغیرہ۔ لیکن مذکورہ بالا دس تراجم میں سے کسی ایک میں بھی یہ معانی مراد نہیں لیے گئے۔ ان سب نے اس آیت میں بھی لفظ ''علق'' کا ترجمہ لوتھڑا یا ''جما ہوا خون'' ہی کیے ہیں۔

ان مترجمین کی تعداد اور صلاحیتوں کے باوجود فرانسیسی ڈاکٹر مورس بوکائیے ان کے لیے سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''......ایک اور چیز جو قاری کو گمراہ کرسکتی ہے، وہ لفظوں کا انتخاب ہے۔ مثال کے طور پر مترجمین کی اکثریت انسان کی پیدائش کی وضاحت کرتے ہوئے خون کے لوتھڑے کا ذکر کرتی ہے۔ ''انسانی افزائش نسل'' کے شعبے میں مہارت رکھنے والے ماہرین کے لیے اس قسم کا بیان نا قابل قبول ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افزائش سے متعلقہ قرآنی آیات کی درست تفہیم کے لیے زبان کے علم کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم سے کام لینا کس قدر ضروری ہے۔''

گویا بالفاظِ دیگر ڈاکٹر بوکائیے کہنا چاہتے ہیں کہ:

''آج تک قرآن کے جتنے تراجم ہوئے، سب غلط تھے اور اب میرا نقطہ نظر درست ہے۔''

ڈاکٹر بوکائیے نے یہ کس طرح فرض کرلیا کہ ترجمہ وہ ہونا چاہیے جو وہ خود کر رہے ہیں۔ وہ ''علق'' کا ترجمہ بجائے ''لوتھڑے'' کے ''چپکنے والی چیز'' کرتے ہیں۔ اور اس سے مراد جنین لیتے ہیں جو آنول نال کے ذریعے رحم سے جڑا ہوتا ہے۔ لیکن جو خواتین صاحب اولاد ہیں، وہ میری اس بات کی تائید کریں گی کہ جو چیز چپکی ہوئی ہوتی ہے وہ ساڑھے آٹھ ماہ تک چپکی ہی رہتی ہے، یعنی چپکی ہوئی چیز تبدیل ہوکر ''چبائے ہوئے گوشت'' نما کسی چیز میں تبدیل نہیں ہوتی۔ تیسری بات ان آیات میں یہ کہی گئی ہے کہ:

''بوٹی ہڈیوں میں تبدیل ہوتی ہے اور پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا جاتا ہے۔''

اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ پہلے ڈھانچا تیار ہوتا ہے اور پھر اس پر گوشت چڑھا...

ہے۔ ڈاکٹر بوکائیے بہ خوبی جانتے ہیں کہ ایسے نہیں ہوتا۔ پٹھے اور ہڈیاں ایک ہی وقت میں بننا شروع ہوتے ہیں، آٹھویں ہفتے کے اختتام تک بہت کم ہڈیوں کی تشکیل ہوئی ہوتی ہے لیکن پٹھے حرکت کے قابل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر T.W.Sadler جو کہ Embryo Anatomy کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ Longman's Medical Embryology کے مصنف ہیں، ایک خط میں تحریر کرتے ہیں کہ:

> ''آٹھویں ہفتے تک پسلیاں وغیرہ اپنی ابتدائی حالت میں ہوتی ہیں اور انھوں نے ہڈیوں کی صورت اختیار نہیں کی ہوتی، جب کہ پٹھے بن چکے ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ہڈیوں کی تشکیل کا آغاز ہی ہوا ہوتا ہے جب کہ پٹھے حرکت بھی کر سکتے ہیں۔''

دو گواہیاں ہمیشہ ایک سے بہتر ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہم دوسری گواہی ڈاکٹر کیتھ مور کی کتاب The Developing Human سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ کتاب کے باب نمبر ۱۵ اور ۱۷ سے ہمیں یہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

(یہاں کچھ سائنسی تفاصیل بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر ولیم کہتے ہیں:)

ایک ملاقات کے دوران میں نے ڈاکٹر مور کو ذاتی طور پر ڈاکٹر ساڈلر کا بیان دکھایا اور انھوں نے اسے بالکل درست قرار دیا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسا کوئی مرحلہ نہیں ہوتا جس میں ہڈیاں بن چکی ہوں اور پھر ان کے اوپر پٹھے بن رہے ہوں۔ پٹھے تو ہڈیوں کے بننے سے کئی دن پیش تر ہی موجود ہوتے ہیں اور ہڈیوں کے بننے کے بعد نہیں بنتے جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ قرآن کا بیان یہاں بالکل غلط ہے۔[1] گویا مسئلہ ابھی حل ہونے سے بہت دور ہے۔

ہم دوبارہ لفظ ''علق'' کی طرف لوٹتے ہیں۔ ڈاکٹر مور، یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن کی ایک

---

(۱) نقل کفر، کفر نہ باشد۔

دوسری آیت میں جونک نما شکل کا ذکر کیا گیا ہے اور چبائی ہوئی شکل کا۔ وہ اس سے ۲۳ دن اور ۳۰ دن عمر کا جنین مراد لیتے ہیں۔ ۲۳ دن کے جنین کا سائز ۳ ملی میٹر ہوتا ہے یعنی ایک انچ کا آٹھواں حصہ۔ اس کی تصویر ڈاکٹر مور کی کتاب میں دی گئی ہے...... مجھے تو یہ کسی طرح بھی جونک نما معلوم نہیں ہوتی۔

لفظ ''علقہ'' کے ان معانی کے ساتھ سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ کوئی ایسی مثال عربی زبان سے پیش نہیں کی گئی جس سے اس لفظ کا ان معنوں میں استعمال ثابت ہوتا ہو۔ ابتدائی ہجری صدیوں سے ایسی مثال پیش کی جانی چاہیے۔ یہ ثابت کرنے کا کہ لفظ عَلَقَ کا مطلب ایک تین ملی میٹر طویل جنین ہوتا ہے جو کہ چپکا ہوا ہوتا ہے، ایک ہی طریقہ ہے کہ پیغمبر ﷺ کے دور کے زبان وادب میں سے خصوصاً اس عربی سے جو قریش بولتے تھے، کوئی مثال پیش کی جائے۔

ایسی مثال پیش کرنا آسان نہیں ہوگا۔ قریش کی عربی پر بہت سی تحقیقات ہو چکی ہیں۔ دورِ اوّل کے مسلمانوں کے لیے عربی زبان پر تحقیق ضروری تھی کیوں کہ وہ قرآنی الفاظ کے درست معانی جاننا چاہتے تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے اپنی زبان اور شاعری کی طرف بہت توجہ دی۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۵ء میں ہونے والی ایک کانفرنس میں پیرس کی جامع مسجد کے سابق امام ابوبکر نے یہ سوال اٹھایا تھا:

''کیا قرآن کی تفہیم پیغمبر اسلام ﷺ کے دور سے آج تک ہمیشہ یکساں طور پر ہوتی رہی ہے؟''

اور ان کا جواب تھا:

''دورِ جاہلیت کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ، ہاں!''

اس سے ہم یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر وہ آیات، جو ہمیشہ مسلمانوں کو روحانی سکون اور امید فراہم کرتی رہی ہیں، آج بھی اسی طرح ہیں تو پھر ان آیات میں موجود سائنسی

بیانات بھی اسی طرح برقرار ہیں۔ جب تک کوئی نیا ثبوت سامنے نہ آ جائے۔ یہ بات نہایت اہم ہے، کیوں کہ بعض آیات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ معلومات ایک نشانی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا، سورۂ مومنون میں کہا گیا ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ○﴾[المومنون: ۱۴-۱۲]

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔''

اسی طرح سورۂ حج میں کہا گیا:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِن مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا﴾

[الحج: ۵]

''لوگو! اگر تمھیں زندگی بعدِ موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم

اس لیے بتا رہے ہیں) تا کہ تم پر حقیقت واضح کریں، ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تا کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تا کہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔“

اگر مکہ اور مدینہ کے رہنے والے لوگوں کے لیے یہ ایک واضح آیت تھی تو ” علقة “ کے لفظ کے ان کے لیے کیا معنی تھے؟ جو انھیں زندگی بعد موت پر ایمان لانے کے لیے قائل کرتے؟

جواب جاننے کے لیے ہمیں حضرت محمد ﷺ کے دور کی تاریخی صورت حال کا جائزہ لینا ہوگا۔ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ محمد ﷺ اور ان کے دور کے لوگ علم الجنین کے حوالے سے کیا خیالات رکھتے تھے۔ ہم Hypocrites سے آغاز کریں گے۔ غالب امکان یہ ہے کہ وہ ۴۶۰ قبل مسیح میں یونانی جزیرے Kuss میں پیدا ہوا تھا۔ اور وہ ”مراحل“ یا Stages کا نظریہ رکھتا ہے، جو کچھ یوں ہے:

اس کے خیال میں مادہ منویہ پورے بدن سے اخذ ہوتا ہے۔ یعنی ماں اور باپ دونوں کے پورے جسم سے۔ جسم کے قوی حصوں سے قوی مادہ حاصل ہوتا ہے اور ضعیف حصوں سے ضعیف مادہ۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھتا ہے اور ماں کے جسم میں خون کے جمنے کی بات کرتا ہے۔ اس سے جنین بنتا ہے جو ایک جھلی میں لپٹا ہوتا ہے۔ مزید برآں وہ کہتا ہے کہ جنین کی پرورش ماں کے خون کے ذریعے ہوتی ہے جو ماں کے رحم تک پہنچتا ہے کیوں کہ حاملہ ہونے کے بعد حیض کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ گوشت بننے کا ذکر کرتا ہے اور آخر میں ہڈیوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جیسے جیسے اعضا بنتے ہیں ان کے اندر ہڈیاں بھی بنتی چلی جاتی ہیں، درخت کی شاخوں کی مانند۔

اب ہم ارسطو کی جانب آتے ہیں۔ تقریباً ساڑھے تین سو قبل مسیح میں لکھی گئی اپنی

کتاب میں ''ارتقائے جنین'' کے مراحل کا ذکر کرتا ہے۔ وہ مادۂ منویہ، حیض کے خون وغیرہ کا ذکر بھی کرتا ہے۔ کتاب کے اس حصے میں وہ نر کے مادۂ منویہ کو'' خالص'' قرار دیتا ہے۔ یعنی مادہ سے حاصل ہونے والا مادۂ منویہ وہ لوازمہ فراہم کرتا ہے جو نر کے مادۂ منویہ کو درکار ہوتا ہے۔ گویا بالفاظ دیگر مادہ منویہ ماہواری کے خون کو جمانے کا باعث بنتا ہے اور پھر اس سے گوشت بنتا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ فطرت خالص ترین اجزائے گوشت اور باقی ماندہ اجزا سے ہڈیاں تشکیل دیتی ہے۔ پہلے ہڈیاں بنتی ہیں اور پھر ان کے گرد گوشت بنتا ہے۔ بالکل یہی بات ہمیں قرآن میں بھی ملتی ہے۔ مادۂ منویہ اور خون سے لوتھڑا بنتا ہے، اس سے ہڈیاں اور پھر ہڈیوں پر گوشت۔

اب ہم ہندوستانی علم الادویہ کی طرف آتے ہیں۔ ۱۲۳ء میں Sharaka اور Shushruta کا کہنا تھا کہ:

> ''نر اور مادہ دونوں تخم ریزی میں حصہ لیتے ہیں۔ نر کا مادۂ منویہ Sukra اور مادہ کا Artava کہلاتا ہے۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ جنین کی تشکیل مادۂ منویہ اور خون سے ہوتی ہے۔''

اب ہم گالن کے نقطہ نظر کی طرف آتے ہیں۔ گالن کا سنہ پیدائش ۱۳۱ عیسوی ہے اور وہ اس علاقے میں پیدا ہوا تھا جو آج کل ترکی میں شامل ہے۔ گالن کا کہنا تھا کہ وہ لوازمہ جس سے جنین کی تشکیل ہوتی ہے خون اور نر و مادہ دونوں طرح کے مادہ منویہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن یہاں گالن سے متفق ہے۔ قرآن میں کہا گیا:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ﴾ [الدھر: ۲]

''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔''

اب ہم آتے ہیں گالن کے بیان کردہ مراحل کی جانب کیوں کہ وہ بھی جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل بیان کرتا ہے۔

پہلا مرحلہ مادہ منویہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں، ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔"

اگر مکہ اور مدینہ کے رہنے والے لوگوں کے لیے یہ ایک واضح آیت تھی تو "علقة" کے لفظ کے ان کے لیے کیا معنی تھے؟ جو انھیں زندگی بعد موت پر ایمان لانے کے لیے قائل کرتے؟

جواب جاننے کے لیے ہمیں حضرت محمد ﷺ کے دور کی تاریخی صورت حال کا جائزہ لینا ہوگا۔ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ محمد ﷺ اور ان کے دور کے لوگ علم الجنین کے حوالے سے کیا خیالات رکھتے تھے۔ ہم Hypocrites سے آغاز کریں گے۔ غالب امکان یہ ہے کہ وہ ۴۶۰ قبل مسیح میں یونانی جزیرے Kuss میں پیدا ہوا تھا۔ اور وہ "مراحل" یا Stages کا نظریہ رکھتا ہے، جو کچھ یوں ہے:

اس کے خیال میں مادہ منویہ پورے بدن سے اخذ ہوتا ہے۔ یعنی ماں اور باپ دونوں کے پورے جسم سے۔ جسم کے قوی حصوں سے قوی مادہ حاصل ہوتا ہے اور ضعیف حصوں سے ضعیف مادہ۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھتا ہے اور ماں کے جسم میں خون کے جمنے کی بات کرتا ہے۔ اس سے جنین بنتا ہے جو ایک جھلی میں لپٹا ہوتا ہے۔ مزید برآں وہ کہتا ہے کہ جنین کی پرورش ماں کے خون کے ذریعے ہوتی ہے جو ماں کے رحم تک پہنچتا ہے کیوں کہ حاملہ ہونے کے بعد حیض کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ گوشت بننے کا ذکر کرتا ہے اور آخر میں ہڈیوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جیسے جیسے اعضا بنتے ہیں ان کے اندر ہڈیاں بھی بنتی چلی جاتی ہیں، درخت کی شاخوں کی مانند۔

اب ہم ارسطو کی جانب آتے ہیں۔ تقریباً ساڑھے تین سو قبل مسیح میں لکھی گئی اپنی

کتاب میں ''ارتقائے جنین'' کے مراحل کا ذکر کرتا ہے۔ وہ مادۂ منویہ، حیض کے خون وغیرہ کا ذکر بھی کرتا ہے۔ کتاب کے اس حصے میں وہ نر کے مادۂ منویہ کو'' خالص'' قرار دیتا ہے۔ یعنی مادہ سے حاصل ہونے والا مادۂ منویہ وہ لوازمہ فراہم کرتا ہے جو نر کے مادۂ منویہ کو درکار ہوتا ہے۔ گویا بالفاظ دیگر مادہ منویہ ماہواری کے خون کو جمانے کا باعث بنتا ہے اور پھر اس سے گوشت بنتا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ فطرت خالص ترین اجزا سے گوشت اور باقی ماندہ اجزا سے ہڈیاں تشکیل دیتی ہے۔ پہلے ہڈیاں بنتی ہیں اور پھر ان کے گرد گوشت بنتا ہے۔ بالکل یہی بات ہمیں قرآن میں بھی ملتی ہے۔ مادۂ منویہ اور خون سے لوتھڑا بنتا ہے، اس سے ہڈیاں اور پھر ہڈیوں پر گوشت۔

اب ہم ہندوستانی علم الادویہ کی طرف آتے ہیں۔ ۱۲۳ء میں Sharaka اور Shushruta کا کہنا تھا کہ؛

''نر اور مادہ دونوں تخم ریزی میں حصہ لیتے ہیں۔ نر کا مادۂ منویہ Sukra اور مادہ کا Artava کہلاتا ہے۔ ان کا بھی یہی خیال تھا کہ جنین کی تشکیل مادۂ منویہ اور خون سے ہوتی ہے۔''

اب ہم گالن کے نقطہ نظر کی طرف آتے ہیں۔ گالن کا سنہ پیدائش ۱۳۱ عیسوی ہے اور وہ اس علاقے میں پیدا ہوا تھا جو آج کل ترکی میں شامل ہے۔ گالن کا کہنا تھا کہ وہ لوازمہ جس سے جنین کی تشکیل ہوتی ہے خون اور نر و مادہ دونوں طرح کے مادہ منویہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن یہاں گالن سے متفق ہے۔ قرآن میں کہا گیا:

﴿إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ﴾ [الدھر: ۲]

''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔''

اب ہم آتے ہیں گالن کے بیان کردہ مراحل کی جانب کیوں کہ وہ بھی جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل بیان کرتا ہے۔

پہلا مرحلہ مادہ منویہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

دوسرا مرحلہ وہ ہوتا ہے جس میں مادہ منویہ اور خون یکجا ہوتے ہیں، یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں مختلف اعضا نے ابھی واضح شکل اختیار نہیں کی ہوتی۔ قرآن میں یوں کہا گیا ہے:

﴿مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ [الحج : ٥]

''پھر گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔''

تیسرا مرحلہ وہ بیان کرتا ہے، جس میں ہڈیوں پر گوشت چڑھتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا قرآن بھی یہ مرحلہ بیان کرتا ہے:

﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا﴾ [المومنون : ١٤]

''پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔''

گالن کو اس زمانے میں کس قدر اہمیت حاصل تھی، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پہلی ہجری صدی کے آغاز کے قریب اسکندریہ میں چار افراد نے علم طب کا ایک مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کا نصاب گالن کی ۱۶ کتابوں پر مشتمل تھا۔ اور یہ کتابیں تیرھویں صدی عیسوی تک نصاب میں شامل رہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد ﷺ کے دور میں خطۂ عرب کی سیاسی، معاشی اور طبی صورت حال کیا تھی؟

اس زمانے میں یمن سے تجارتی قافلے مکہ اور مدینہ سے ہوتے ہوئے شمال کی طرف جایا کرتے تھے۔ تورات کا عبرانی سے Cyriac زبان میں ترجمہ ہو چکا تھا جو آرامی زبان کی ایک قسم ہے اور عربی سے مشابہ ہے۔ یہ ترجمہ سنہ ۴۶۳ء میں ہی ہو چکا تھا۔ برٹش میوزیم میں اس کی ایک نقل موجود ہے۔ سنہ ۵۰۰ء کے بعد عرب کے شمالی صحراؤں میں یہی زبان بولی جاتی تھی۔ اور ان علاقوں میں رہنے والے عیسائی اور یہودی قبائل کے پاس تورات اسی زبان میں دستیاب تھی۔

اسی زمانے میں Syrgies Cyrra Cynie [؟] نے، جو ۵۳۶ء میں قسطنطنیہ

میں فوت ہوا، علم طب کی کئی کتابوں کا یونانی سے Cyraic زبان میں ترجمہ کیا۔ ان میں گالن کی ۲۶ کتابیں بھی شامل تھیں۔ اس طرح یہ کتابیں خسرو اوّل کی عجمی سلطنت اور قبیلہ غسان کے علاقوں میں دستیاب تھیں۔ اس قبیلے کا علاقہ اس زمانے میں مدینے کے قریب تک پہنچ چکا تھا۔ شہنشاہِ ایران کسریٰ اول کو خسروِ اعظم کہا جاتا تھا۔ اس کی افواج کی فتوحات یمن تک جا پہنچی تھیں۔ وہ علم دوست بادشاہ تھا۔ اس نے کئی مدارس بھی قایم کیے۔ ان میں جندی شاپور کا مدرسہ بھی شامل تھا۔ جو خسروِ اول کے طویل ۴۸ سالہ دورِ اقتدار کے دوران میں اپنے وقت کا عظیم ترین علمی مرکز بن گیا تھا۔

جندی شاپور کے مدرسے میں یونانی، یہودی، نسطوری، ایرانی اور ہندی افکار پر آزادانہ تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ تعلیم و تدریس زیادہ تر Syriac زبان میں ہوتی تھی۔ تراجم کے ذریعے یں ارسطو، گالن اور Hypocrites کے خیالات و افکار جندی شاپور کے مدرسے میں آسانی سے دستیاب تھے۔

اگلے مرحلے میں فاتح عربوں نے نسطوریوں کو مجبور کیا کہ وہ ان کتابوں کو Syriac زبان سے عربی میں ترجمہ کریں۔ ترجمہ مشکل بھی نہیں تھا کیوں کہ دونوں زبانوں کی گرامر یکساں ہے۔ جہاں تک علم طب کی مقامی صورت حال کا تعلق ہے، ہم جانتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس خطے میں طبیب موجود تھے۔ حارث ان میں سب سے مشہور تھا۔ وہ اپنے وقت کا سب سے ماہر طبیب تھا۔ اس کا تعلق طائف کے قبیلۂ بنی ثقیف سے تھا۔ وہ چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے یمن اور پھر ایران کا سفر کیا اور جندی شاپور کے مدرسے میں طب کی تعلیم حاصل کی۔ اس طرح وہ ارسطو اور گالن کے نظریات سے آگاہ ہوا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے ایران میں ہی حکمت شروع کی۔ اس دوران سے خسرو کے دربار میں بھی طلب کیا گیا۔ جہاں اس نے شہنشاہ سے طویل گفتگو کی۔

تقریباً اسلام کے آغاز کے وقت وہ خطۂ عرب میں واپس آیا اور طائف میں آباد ہوگیا۔ اس دوران یمن کا ایک بادشاہ ابوخیر کسی بیماری کے سلسلے میں اس کے پاس

طائف آیا۔ صحت یاب ہونے کے بعد اس نے حارث کو بہت سی دولت اور ایک کنیز انعام میں عطا کی۔

اگرچہ حارث نے علم طب پر کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن کئی طبی معاملات پر اس کے خیالات خسرو سے اس کی گفتگو کی صورت میں محفوظ ہیں۔ آنکھ کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ یہ چربی سے بنی ہوتی ہے یعنی آنکھ کی سفیدی، جب کہ سیاہ حصے کو وہ پانی قرار دیتا ہے اور نظر کو وہ ''ہوا'' قرار دیتا ہے۔ آج ہم جانتے ہیں کہ یہ تمام باتیں غلط ہیں لیکن یونانی خیالات یہی تھے۔ اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حارث کو یونانی علما کے افکار سے آگاہی حاصل تھی۔ اس صورت حال کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے ''Dr. Lucaine la Clerk'' اپنی کتاب ''Eastword Delamitry Arabs'' میں لکھتے ہیں:

''حارث نے علم طب جندی شاپور میں حاصل کیا اور محمد ﷺ کو علم طب کے بارے میں معلومات جزوی طور پر حارث سے حاصل ہوئیں تھیں۔ لہٰذا دونوں کے ہاں یونانی خیالات کے آثار مل جاتے ہیں۔ محمد ﷺ بعض اوقات مریضوں کا علاج خود کرتے تھے لیکن پیچیدہ امراض کی صورت میں وہ حارث کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ علم طب کا ایک اور عالم لادن بن حارث بھی تھا۔ اگرچہ اس کا طبیب حارث سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ محمد ﷺ کا رشتہ دار تھا اور خسرو کے دربار میں حاضر ہو چکا تھا۔ بہرحال اسے محمد ﷺ سے ہمدردی نہیں تھی۔ اور وہ قرآن کے بعض بیانات پر معترض تھا۔ محمد ﷺ نے اسے معاف نہیں کیا اور جب وہ جنگ بدر میں گرفتار ہوا تو اسے سزائے موت دی گئی۔''

گفتگو کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے:

- ❑ ۶۰۰ ء میں مکہ اور مدینہ میں رہنے والے عربوں کے روابط حبشہ یمن، فارس اور بازنطینی سلطنت کے ساتھ قایم تھے۔

- ❑ محمد ﷺ کا ایک رشتہ دار فارسی زبان اتنی اچھی جانتا تھا کہ موسیقی کے حوالے سے اس زبان میں تحقیق کر سکے۔
- ❑ غسانی قبیلہ جو صحرائے عرب کے ایک حصے پر حکمران تھا اور جس کی سرحدیں مدینہ سے ملتی تھیں، وہی زبان بولتا تھا جو جندی شاپور کے مدرسے میں طب کی تعلیم دینے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ یمن کا ایک بادشاہ اپنے علاج کے سلسلے میں طائف آیا تھا۔ اور طائف کے طبیب حارث کے زیرِ علاج رہا جس نے طب کی تعلیم جندی شاپور کے مدرسے میں حاصل کی تھی جو اس دور میں دنیا بھر میں طب کی تعلیم کا بہترین ادارہ تھا۔ محمد ﷺ بھی بعض اوقات علاج کے لیے مریضوں کو حارث کے پاس بھیجا کرتے تھے۔
- ❑ محمد ﷺ کے دور میں ہی اسکندریہ میں ایک نیا مدرسہ بھی طب کی تعلیم کے لیے قایم ہوا تھا، جس کے نصاب میں گالن کی سولہ کتابیں شامل تھیں۔ اس ذریعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس بات کے وافر امکانات موجود تھے کہ محمد ﷺ اور ان کے اصحاب ارسطو اور گالن وغیرہ کے تولیدی نظریات سے آگاہ ہو سکتے۔ جس کا ذریعہ حارث اور دیگر طبیبوں کی صورت میں موجود تھا۔

لہٰذا جب قرآن مکی دور کی آخری سورتوں میں سے ایک سورۃ میں کہتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَ لِتَبْلُغُوْۤا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝﴾

[المومن: ٦٧]

''وہی تو ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر وہ تمھیں بچے کی شکل میں نکالتا ہے، پھر تمھیں بڑھاتا ہے تاکہ تم اپنی پوری طاقت کو پہنچ جاؤ، پھر اور بڑھاتا ہے تاکہ تم بڑھاپے کو پہنچو اور تم میں سے

کوئی پہلے ہی بلا لیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ تم اپنے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور اس لیے کہ تم حقیقت کو سمجھو۔"

اور پھر سورۂ حج میں بھی کہا گیا ہے:

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ط﴾

[الحج : ٥]

"لوگو! اگر تمھیں زندگی بعدِ موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں، پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔"

یہاں ہم یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اُن سے کیا مطالبہ کیا جا رہا تھا؟ کس بات پر غور کرنے کی دعوت دی جا رہی تھی؟ جواب بالکل واضح ہے۔ وہ وہی سمجھ رہے تھے اور اسی بات پر غور کر رہے تھے جو اس دور کا علم تھا یعنی وہ تولیدی مراحل جن کی تعلیم یونانی حکما نے دی تھی۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ محمد ﷺ کے مخاطبین ان یونانی حکما کے نام بھی جانتے تھے۔ لیکن وہ جنین کے ارتقا کے ان مراحل کے بارے میں ضرور جانتے تھے جن کے

بارے میں ان یونانی حکما نے بتایا تھا۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ نر کا مادہ منویہ حیض کے خون کے ساتھ مل کر اسے جما دیتا ہے اور پھر اس سے بچہ بنتا ہے۔ وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ ایک ایسا مرحلہ بھی ہوتا ہے جس میں جنین نیم تشکیلی حالت میں ہوتا ہے۔ اور ان کا یہ بھی خیال تھا کہ پہلے ہڈیاں بنتی ہیں اور پھر ان پر گوشت چڑھتا ہے۔ اللہ ان کی معلومات کو ہی ایک نشانی کے طور پر برت رہا تھا۔ اور یوں سامعین اور قارئین کو اپنی طرف رجوع کی دعوت دے رہا تھا۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ معلومات درست نہیں تھیں۔

اب ہمیں محمد ﷺ کے بعد کے ادوار کے اطبا پر توجہ دینی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ اطباء قرآن پر اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے لیکن یہ ماہرین سولھویں صدی عیسوی تک ارسطو اور گالن وغیرہ کے تصورات ہی کی پیروی کرتے رہے۔

اگر ''علقہ'' کا درست ترجمہ ''جونک نما شے'' ہے جیسا کہ بعض جدید مسلمان مفکرین مثلاً شبیر علی وغیرہ دعویٰ کرتے ہیں تو پھر ان اطبا کو بھی یہی کہنا چاہیے لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔ یونانی اطبا کے نظریات کی مدد سے قرآنی بیانات کی وضاحت کی جارہی تھی اور قرآن کے ایسے معانی بیان کیے جاتے تھے جو یونانی نظریات کی تائید کرتے ہوں۔

مثلاً ابن سینا کے بقول جنین کی تشکیل دو اجزا سے ہوتی ہے۔ مردانہ مادۂ منویہ، جو عامل کا کردار ادا کرتا ہے اور دوسرے زنانہ مادۂ منویہ جو پہلے حیض کے خون کا جزو ہوتا ہے اور جو ایسا لوازمہ فراہم کرتا ہے جس سے مادہ منویہ کی تشکیل ہوتی ہے۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ابن سینا زنانہ مادۂ منویہ کو وہی کردار دیتا ہے جو ارسطو نے حیض کے خون کو دیا تھا۔ ابن سینا کو جو اہمیت اور استناد قدیم یورپ میں سائنس اور فلسفے کے حوالے سے حاصل تھا، وہ محتاجِ بیان نہیں۔

اب ہم ابن قیم الجوزیہ کی طرف آتے ہیں۔ ابن قیم نے یونانی طب اور قرآنی بیانات کی مطابقت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا ...... وہ اپنی تصنیف ''کتاب الاجنہ'' کے تیسرے باب میں کہتا ہے:

''مادۂ منویہ ایک جھلی میں ہوتا ہے، اس کی بڑھوتری کا سبب ماں کا خون ہوتا ہے جو رحم میں پہنچتا ہے۔ کچھ جھلیاں ابتدا میں بن جاتی ہیں، کچھ دوسرے مہینے میں اور کچھ تیسرے مہینے میں۔''

جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا، ماں کے خون کے رحم میں جانے کی بات Hippocrates نے بھی کی ہے۔ یہی بات قران بھی کہتا ہے:

﴿يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمَاتٍ ثَلَاثٍ﴾ [الزمر: ٦]

''وہ تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمھیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔''

اس کے بعد ابن قیم اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہر جھلی کی اپنی تاریکی ہوتی ہے اور قرآن میں خدا جب ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے تک ارتقا کا ذکر کرتا ہے تو ان تین تاریک پردوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔

بیش تر مفسرین اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ پہلی تاریکی پیٹ کی، دوسری رحم مادر کی اور تیسری جنین پر لپٹی ہوئی جھلی کی ہوتی ہے۔

اب ہم دوسری مثال دیکھتے ہیں:

''Hippocrates کا کہنا ہے کہ منہ اچانک کھل جاتا ہے، ناک اور کان بن جاتے ہیں پھر کان کھل جاتے ہیں اور پھر آنکھیں جو ایک شفاف سیال سے بھری ہوتی ہیں......''

جب کہ محمد ﷺ کہتے ہیں کہ:

''میں اس کی عبادت کرتا ہوں جس نے میرا چہرہ بنایا اور مجھے سماعت بخشی اور بینائی عطا کی......''

مماثلت بالکل واضح ہے۔ ابن قیم بھی Hippocrates ہی کی بات کر رہا ہوتا ہے،

جب وہ ماں کے خون کے رحم میں جنین تک پہنچنے کا ذکر کرتا ہے۔

اور وہ ایسا کر سکتے تھے کیوں کہ، جیسا کہ ہم نے دیکھا، محمد ﷺ کے دور میں پڑھے لکھے لوگ یونانی علم الادویہ سے ناواقف نہیں تھے۔ البتہ ہمارے لیے آج کے تناظر میں اہم بات یہ ہے کہ قرآن کسی بھی جگہ یونانی علم طب کی اصلاح نہیں کرتا ہے۔ ابن قیم کسی جگہ یہ اعلان نہیں کرتا کہ ''نہیں، تم سب غلط کہہ رہے ہو، علقہ کا مطلب تو چپکنے والی چیز یا جونک نما چیز ہوتا ہے۔'' بلکہ اس کے برعکس وہ قرآن اور یونانی علم طب کی مطابقت اور مشابہت ہی ثابت کرتا ہے۔ اور ان کی یہ مطابقت غلطی پر ہے۔ یعنی وہ ایک غلطی پر متفق ہیں۔ ایک قطعی مثال بیضاوی کی تفسیر ہے۔ یہ تفسیر ۱۲۰۰ء میں لکھی گئی۔ اور یہاں اس تفسیر میں ہم دیکھتے ہیں کہ علقہ کا مطلب ''جما ہوا خون'' بتایا گیا ہے۔ پھر گوشت کی بوٹی، جس کی جسامت بس اس قدر ہوتی ہے کہ جسے چبایا جا سکے، اور اسی طرح آگے بات چلتی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں ذکر کیا تھا۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جنین کے مختلف مراحل میں ارتقا کا نظریہ ایک جدید نظریہ ہے۔ اور یہ کہ قرآن نے ان مراحل کا ذکر کر کے جدید علم الجنین کی معلومات چودہ سو برس پیش تر ہی پیش کر دی تھیں۔ لیکن اس مطالعے کے دوران میں ہم نے دیکھا کہ ارسطو، قدیم ہندو اور گالن وغیرہ بھی ان مراحل کے بارے میں جانتے تھے اور انھوں نے ان مراحل پر گفتگو بھی کی ہے اور یہ قرآن سے بہت پہلے کی بات ہے۔

قرآن کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہی نظریات جو یونانی علما نے اور قرآن نے بیان کیے تھے، ابن سینا اور ابن قیم تک پہنچے اور بعینہ اسی طرح پہنچے جس طرح ان کی تعلیم گالن نے دی تھی۔

جہاں تک ہڈیوں کا تعلق ہے، اس حوالے سے بھی ہم نے بات کی اور جیسا کہ ڈاکٹر مور نے بڑی وضاحت سے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے کہ پہلے پٹھے بنتے ہیں اور بیک وقت ہڈی بھی اپنی ابتدائی صورت میں تشکیل پانا شروع کر دیتی ہے۔ ایسا کوئی مرحلہ نہیں ہوتا جس

میں ہڈیوں کا ڈھانچہ تو بن چکا ہو لیکن ابھی اس پر گوشت نہ چڑھا ہو۔

اسی طرح یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ لفظ ''علقہ'' کے معنی ''لوتھڑا'' ہوتے ہیں اور یہ کہ محمد ﷺ نے قریش سے جو یہ کہا کہ جنین کے ارتقا میں عورت کا حصہ حیض کے خون کی صورت میں ہوتا ہے تو یہ بات ان کے لیے قابل فہم تھی۔

لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ قرآن کا یہ بیان کہ انسان نطفے سے اور پھر خون کے لوتھڑے سے بنتا ہے، پہلی صدی ہجری کی سائنسی صورتِ حال کے عین مطابق تھا۔ یعنی جس وقت قرآن سامنے آیا، اس وقت کی علمی سطح کے مطابق تھا۔ لیکن جب مقابلہ بیسویں صدی عیسوی کے ساتھ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہپوقریطس غلطی پر ہے، ارسطو غلطی پر ہے، گالن غلطی پر ہے اور قرآن بھی غلطی پر ہے۔ (۱) یہ سب ایک بہت بڑی غلطی کر رہے تھے۔

اب ہم تھوڑا ذکر ''چاندنی'' کا کریں گے۔ کیا قرآن واقعی یہ بتاتا ہے کہ ''چاند کی روشنی، سورج کی روشنی کا انعکاس ہوتا ہے۔'' اور اس دور میں بتاتا ہے جب لوگوں کو ابھی اس بات کا علم نہیں ہوا تھا؟

سورۂ نوح میں کہا گیا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ○ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ○ ﴾ [نوح: ۱۶۔۱۵]

''کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہہ بر تہہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا؟''

یہاں چاند کو ''نور'' اور سورج کو چراغ یعنی ''سراج'' کہا گیا ہے۔ کچھ مسلمانوں کا دعویٰ یہ ہے کہ چوں کہ قرآن سورج اور چاند کی روشنی کے لیے مختلف الفاظ استعمال کرتا ہے لہٰذا اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سورج اور چاند کی روشنی مختلف قسم کی ہوتی ہے۔ سورج اپنی روشنی خارج کرتا ہے جب کہ چاند سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔ یہ دعویٰ شبیر علی نے

(۱) نقل کفر، کفر نہ باشد۔

اپنے کتابچے میں اور ڈاکٹر ذاکر نے اپنی تقریر میں بڑے زور وشور سے کیا ہے۔ اپنی ویڈیو ''کیا قرآن کلامِ الٰہی ہے؟'' میں ذاکر نائیک واضح طور پر کہتے ہیں:

''...... چاند سے آنے والی روشنی آتی کہاں سے ہے؟ پہلے ہمارا خیال تھا کہ یہ چاند کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ لیکن آج سائنسی ترقی کی وجہ سے ہم جانتے ہیں کہ چاند کی روشنی اس کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ سورج کی روشنی کا انعکاس ہوتی ہے۔ یہاں میں ایک سوال پوچھوں گا۔ قرآنِ مجید کی سورۂ فرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ تَبَارَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝ ﴾ [الفرقان : ٦١]

''بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔''

عربی میں چاند کے لیے لفظ قمر استعمال ہوتا ہے اور اس کی روشنی کے لیے منیر کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ منعکس روشنی یا ''نور'' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا قرآن یہ کہتا ہے کہ چاند کی روشنی منعکس روشنی ہے، تم کہتے ہو کہ تم نے یہ بات آج دریافت کی ہے تو پھر قرآن نے یہ بات ۱۴۰۰ برس پہلے ہی کس طرح بیان کردی تھی؟......''

ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر نے یہاں بتایا کہ چاند کو عربی میں قمر کہتے ہیں اور اس کی روشنی کے لیے منیر کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ نور یا منعکس روشنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نے واضح طور پر نور کو منعکس روشنی قرار دیا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ نہ صرف سائنسی حقائق کے مطابق ہونا چاہیے بلکہ اس کا ایک معجزاتی پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ یہ بات کہ چاند کی روشنی منعکس ہوتی ہے نسبتاً حال ہی میں دریافت ہوئی ہے۔

یہ بات تو بالکل درست ہے کہ چاند کی روشنی اپنی نہیں ہوتی بلکہ درحقیقت سورج کی

روشنی کا انعکاس ہوتی ہے لیکن یہ بات محمد ﷺ کے دور سے ایک ہزار برس پہلے ہی معلوم تھی۔ اور یہ کوئی جدید دریافت نہیں ہے۔ ارسطو نے ۳۶۰ ق م میں ہی چاند پر زمین کا سایہ پڑنے کی بات کی تھی اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ زمین گول ہے۔ اور چاند پر سایہ پڑنے کی بات وہ اسی صورت میں کرسکتا تھا اگر اسے یہ علم تھا کہ چاند سے روشنی خارج نہیں ہوتی۔ اگر آپ اس کے باوجود اسے معجزہ قرار دینے پر مصر ہیں تو پھر ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ خود قرآن سے بھی اس دعوے کی تائید ہوتی ہے یا نہیں؟

سب سے پہلے ہم لفظ ''سراج'' پر غور کریں گے۔

یہ لفظ سورۂ نوح میں استعمال ہوا ہے جس کا حوالہ پہلے دیا گیا۔ پھر سورۂ فرقان میں، جہاں اس کا مطلب چراغ ہے اور سورج کے لیے استعمال ہوا ہے۔ پھر سورۂ النبا میں جہاں ﴿ سِرَاجًا وَّهَّاجًا ﴾ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی ''نہایت روشن اور گرم چراغ''۔

لفظ ''نور'' اور ''منیر'' ایک ہی مادے سے نکلے ہیں۔ لفظ منیر قرآن میں چھ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ سورۂ آل عمران، سورۂ حج، سورۂ لقمان اور سورۂ فاطر میں۔ ایک اصطلاح استعمال ہوئی ''کتاب المنیر'' جس کا ترجمہ پکتھال نے ''The Scripture giving Light'' اور عبداللہ یوسف علی نے ''A Book of Enlightment'' کیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہاں مراد علم کی روشنی پھیلانے والی کتاب ہے اور ''منعکس روشنی'' کا کوئی ذکر نہیں۔ نور کا لفظ سورۂ نوح اور سورۂ یونس میں استعمال ہوا ہے۔ کہا گیا ہے کہ ''وہی ہے جس نے چاند کو نور بنایا''۔ یہاں خود چاند کو روشنی بتایا جارہا ہے اور یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ چاند روشنی کو منعکس کرتا ہے۔

مزید برآں بعض دیگر آیات میں خود اللہ کو نور قرار دیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر سورۂ نور میں قرآن کا ایک خوبصورت بیان ہے جس میں کہا گیا ہے:

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ

مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ ﴾ [النور: ۳۵]

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا۔ اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو اور نہ غربی۔ جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو، چاہے اس کو آگ نہ لگے۔''

چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ''نور'' کا لفظ چاند کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور اللہ کے لے بھی۔ تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ اللہ کا نور بھی منعکس نور ہے؟ میرے خیال میں تو نہیں۔ لیکن اگر آپ اس پر مصر ہیں کہ ''نور'' منعکس یا ''مانگی ہوئی روشنی'' ہی کو کہتے ہیں تو پھر ہم متذکرہ بالا آیت میں دیکھ چکے ہیں کہ اللہ زمین اور آسمانوں کا نور ہے۔ تو پھر اس روشنی کا ''سراج'' یا اصل منبع کیا ہے جس کا نور اللہ ہے؟

ذرا سوچیے؟

اگر اللہ کو ''نور'' کہا گیا ہے تو پھر یہ کس روشنی کا، کس ''سراج'' کا عکس ہے؟

دیکھیے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ''سراج'' کون ہے؟ لیکن قرآن کا جواب آپ کو حیران کردے گا۔ سورۂ احزاب میں ہم دیکھتے ہیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ ﴾ [الاحزاب: ۴۵-۴۶]

''اے نبیؐ! ہم نے تمھیں بھیجا ہے، گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔''

اس آیت میں محمد ﷺ کو ''روشن چراغ'' کہا گیا ہے۔ عربی میں ﴿ سِرَاجًا

مُّنِيْرًا ﴾ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔لسانی اور روحانی ہر دو لحاظ سے یہاں بحث کا اختتام ہو جاتا ہے۔لسانی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں ''سراج'' اور ''منیر'' کے الفاظ بیک وقت استعمال ہوئے ہیں اور ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں یعنی محمد ﷺ کی روشن شخصیت کے لیے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ منیر کا لفظ اس آیت میں ''منعکس روشنی'' کے لیے استعمال نہیں ہوا، بلکہ کسی بھی آیت میں یہ لفظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔اس کا مطلب صرف ''روشن'' ہے۔محمد ﷺ کے زمانے کے لوگ سمجھتے تھے کہ چاند روشن ہے اور درست سمجھتے تھے، اسی طرح جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے لوگ سورج کو بڑی روشنی اور چاند کو چھوٹی روشنی سمجھتے تھے اور وہ بھی ٹھیک سمجھتے تھے۔

لیکن اگر آپ اپنی بات پر اصرار کریں گے کہ عربی لفظ ''نور'' کا مطلب ''منعکس روشنی'' ہی ہوتا ہے تو پھر قرآن میں ان الفاظ کے استعمال سے یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ محمد ﷺ سورج کی طرح اور اللہ چاند کے مانند ہے۔کیا ڈاکٹر ذاکر نائیک واقعی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ محمد ﷺ روشنی کا اصل ذریعہ ہیں اور اللہ اس روشنی کا عکس ہے؟

اس قسم کے نام نہاد ''سائنسی دعوے'' کیے ہی کیوں جاتے ہیں جن کا دفاع کوئی مسلمان خود قرآن کی روشنی میں بھی نہیں کرسکتا۔اس طرح ہوتا یہ ہے کہ اس قسم کے مکالمے میں ایماندارانہ بحث مباحثے کے امکانات بہت کم رہ جاتے ہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہو جاتے ہیں۔

اب ہم آگے چلتے ہیں اور آبی چکر ''Water Cycle'' کا جائزہ لیتے ہیں۔بعض مسلمانوں کا کہنا ہے کہ قرآن ہمیں جدید سائنس سے پہلے ہی آبی چکر کے بارے میں معلومات فراہم کر چکا تھا۔

آبی چکر ہوتا کیا ہے؟

آبی چکر کے چار مراحل ہوتے ہیں۔

پہلے مرحلے میں سمندروں اور زمین پر موجود پانی سے بخارات اٹھتے ہیں۔ دوسرے

مرحلے میں یہ بخارات بادلوں میں تبدیل ہوتے ہیں۔ تیسرے مرحلے میں بادلوں سے بارش ہوتی ہے اور چوتھے مرحلے میں اس بارش کی وجہ سے نباتات اگتی ہیں۔ یہ سب کچھ بڑا سیدھا سادا معلوم ہوتا ہے اور دوسرے، تیسرے اور چوتھے مرحلے کے بارے میں تو ہر کوئی جانتا ہے۔ شہروں میں رہنے والے لوگ بھی بہ خوبی جانتے ہیں کہ بادل آتے ہیں پھر بارش ہوتی ہے اور پھر پودے بڑھتے ہیں۔ البتہ بات پہلے مرحلے کی ہے یعنی بخارات اٹھنے کی، کیوں کہ یہ عمل ہمیں نظر نہیں آتا، یہی مرحلہ مشکل ہے اور اسی مرحلے کا ذکر قرآن میں موجود نہیں۔ اب ہم بائبل کی طرف دیکھتے ہیں، بائبل میں ایک پیغمبر جس کا تعلق ۷۰۰ ق م سے ہے، کہتا ہے:

''وہی ثریا اور جبار ستاروں کا خالق ہے جو موت کے سایہ کو مطلعِ نور اور روزِ روشن کو شبِ دیجور بنا دیتا ہے اور سمندر کے پانی کو بلاتا اور روئے زمین پر پھیلاتا ہے۔ جس کا نام خداوند ہے۔'' [عاموس ۸:۵]

یہاں پہلے اور تیسرے مرحلے کا ذکر موجود ہے۔

ایک اور نبی ایوب علیہ السلام ہیں جن کا زمانہ سنہ ہجری کے آغاز سے کم از کم ایک ہزار سال قبل کا ہے، وہ کہتے ہیں:

''دیکھ خدا بزرگ ہے اور ہم اسے نہیں جانتے۔

اس کے برسوں کا شمار دریافت سے باہر ہے۔

کیوں کہ وہ پانی کے قطروں کو اوپر کھینچتا ہے۔

جو اسی کے ابخرات سے بارش کی صورت میں ٹپکتے ہیں۔

جن کو افلاک انڈیلتے اور انسان پر کثرت سے برساتے ہیں۔''

[ایوب ۲۸_۲۶:۳۶]

سو یہاں، بائبل میں ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے یعنی سب سے مشکل مرحلے کا بیان قرآن سے ہزار سال پہلے سے موجود ہے۔ اب ہم آگے بڑھتے ہیں اور پہاڑوں کے ذکر کا جائزہ

لیتے ہیں۔قرآن میں کوئی درجن بھر آیات ایسی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے پہاڑوں کو زمین پر مضبوطی سے قایم کیا ہے۔اوران میں چند آیات میں پہاڑوں کو ایمان والوں کے لیے رحمت اور کافروں کے لیے یاددہانی قرار دیا گیا ہے۔

اس کی ایک مثال سورۂ لقمان میں موجود ہے:

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ○ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِىْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ○﴾ [لقمٰن: ۱۱۔۱۰]

’’اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں، اس نے زمین میں پہاڑ جمادیے تاکہ وہ تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے۔اس نے ہر طرح کے جانور زمین میں پھیلا دیے اور آسمان سے پانی برسایا اور زمین میں قسم قسم کی عمدہ چیزیں اُگا دیں۔یہ تو ہے اللہ کی تخلیق، اب ذرا مجھے دکھاؤ ان دوسروں نے کیا پیدا کیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔‘‘

اس آیت میں پہاڑ چھ یاددہانیوں میں سے ایک ہے۔اسی طرح سورۂ انبیاء میں کہا گیا ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا فِى الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ○ ﴾ [الانبیاء: ۳۱]

’’اور ہم نے زمین میں پہاڑ جمادیے تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے اور اس میں کشادہ راہیں بنادیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کرلیں۔‘‘

سورۂ نحل میں کہا گیا:

﴿ وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ

تَهْتَدُوْنَ ۝ ﴾ [النحل: ١٥]

''اس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تاکہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے، اس نے دریا جاری کیے اور قدرتی راستے بنائے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔''

اگلی دو آیات میں ایک اور تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔

سورۃ النباء میں کہا گیا:

﴿ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝ ﴾ [النباء: ٧-٦]

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔''

﴿ اَوْتَادًا ﴾ وہ میخیں ہوتی ہیں جو خیمہ گاڑنے کے کام آتی ہیں۔ اسی طرح سورۃ غاشیہ میں کہا جاتا ہے:

﴿ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ ﴾ [الغاشیہ: ١٩-١٧]

'' (یہ لوگ نہیں مانتے) تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے اُٹھایا گیا؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی؟''

ایک تیسری تصویر لفظ ''رواسی'' کے استعمال سے سامنے آتی ہے، یہ لفظ اسی مادے سے نکلا ہے جس سے وہ لفظ نکلا ہے جو عربی میں ''لنگر'' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا یہاں بھی وہی تصور موجود ہے، زمین کو کانپنے سے بچانے کا۔ ان سب تصورات سے یہ بات واضح ہے کہ محمد ﷺ کے ماننے والے یہی یقین رکھتے تھے کہ پہاڑ دراصل زمین میں لنگر یا میخوں کی طرح پھینکے گئے ہیں تاکہ یہ زمین کو قایم رکھیں جس طرح لنگر جہاز کو روکے رکھتا ہے یا میخیں خیمے کو روکے رکھتی ہے۔ تاکہ زمین حرکت نہ کرے یا بالفاظ دیگر زلزلے نہ آئیں۔

لیکن درحقیقت یہ بات غلط ہے، کیوں کہ پہاڑوں کی تشکیل تو زلزلوں کا سبب بنتی

ہے۔لہٰذا یہ آیات یقیناً ایک مسئلہ پیش کرتی ہیں۔ ڈاکٹر مورلیس بوکائیے کو بھی اس بات کا اندازہ تھا اور انھوں نے اپنی کتاب ''بائبل، قرآن اور سائنس'' میں اس حوالے سے بحث بھی کی ہے۔ پہاڑوں کے بارے میں مذکورہ بالا آیات درج کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ جدید ماہرین ارضیات کہتے ہیں کہ یہ سطح ارضی کے نقائص پہاڑوں کو بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔اور سطح ارضی کی مضبوطی کا سبب یہی نقائص ہوتے ہیں۔

جب اس بارے میں ارضیات کے پروفیسر Dr. David A. Young سے پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا:

''اگرچہ یہ بات درست ہے کہ بہت سے پہاڑی سلسلے چٹانوں کی تہوں پر مشتمل ہوتے ہیں اور یہ تہیں بہت عظیم الشان ہوتی ہیں لیکن یہ بات درست نہیں کہ ان تہوں کی وجہ سے سطح ارضی مستحکم ہوتی ہے۔ بلکہ ان تہوں کی موجودگی بذاتِ خود چٹانوں کے عدم استحکام کی نشانی ہوتی ہے۔''

گویا بہ الفاظِ دیگر پہاڑ زمین کے استحکام کا باعث نہیں ہوتے بلکہ اس کے برعکس پہاڑوں کی تشکیل زمین کے کانپنے کا سبب بنتی رہی ہے اور آج بھی بنتی ہے۔ دورِ جدید کے ارضیاتی نظریات کی روشنی میں دیکھا جائے تو سطح ارضی کا تجزیہ اس طرح کیا گیا ہے کہ ٹھوس ارضی سطح دراصل مختلف تہوں اور حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ تہیں ایک دوسرے کے لحاظ سے حرکت بھی کرتی ہیں۔ بعض اوقات تو یہ تہیں علیحدہ بھی ہوجاتی ہیں۔ جس کی مثال شمالی اور جنوبی امریکہ کی یورپ اور جنوبی افریقہ سے علیحدگی ہے۔ اسی طرح بعض اوقات اس کے برعکس یہ ہوتا ہے کہ یہ تہیں ایک دوسرے کے قریب ہوجاتی ہیں اور ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں، جس کے نتیجے میں زلزلے آتے ہیں۔ اس کی ایک مثال مشرقِ وسطیٰ میں ملتی ہے جہاں عرب علاقے کی ایران کی جانب حرکت کے نتیجے میں ایک پہاڑی سلسلے نے تشکیل پائی۔

اسی طرح دنیا بھر میں سڑک پر سفر کرتے ہوئے ایسے مشاہدات ہوتے ہیں کہ کچھ ریتلی پہاڑیاں، جن کی شکل پہلے مختلف تھی اب بدل چکی ہے۔ ان کی حالت تبدیل ہونے کا

سبب بھی زلزلے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ تہیں ایک دوسرے سے رگڑ کھانا شروع کر دیتی ہیں۔ اس دوران بہت بڑے پیمانے پر قوت پیدا ہوتی ہے، اس قوت کے نتیجے میں ایک بہت بڑی لہر پیدا ہوتی ہے اور پھر فوراً ہر چیز ساکن ہو جاتی ہے۔

میکسیکو میں آنے والے ایک حالیہ زلزلے کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ جب زلزلہ آیا تو ایک تہہ پورے تین میٹر تک اچھلی تھی۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر آپ کا گھر اچانک تین میٹر اچھلے تو کیا قیامت برپا ہوگی؟ ایک دوسری طرح کے پہاڑ وہ ہوتے ہیں جو آتش فشاں کے ذریعے بنتے ہیں۔ زمین کے اندر سے لاوا اور راکھ قوت کے ساتھ یوں برآمد ہوتے ہیں کہ ان سے ایک پہاڑ بن جاتا ہے۔ ایسا پہاڑ سمندر کی تہہ سے بھی برآمد ہو سکتا ہے۔

بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ لاوے کے دباؤ سے ایک سطح ابھرتی ہے مگر پھٹتی نہیں ایسی جگہ پر جب دباؤ بڑھتا ہے تو یہ پھٹ جاتی ہے جسے آتش فشاں کا پھٹنا کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایسا ایک واقعہ جنوبی بحر الکاہل میں کریکاٹو کے مقام پر ۱۸۸۳ء میں ہوا تھا۔ اس واقعہ میں ایک پورا جزیرہ ہی پھٹ گیا تھا۔ اسی طرح ماؤنٹ سینٹ ہیلینا کے واقعے میں بھی ایک پورا پہاڑ ہی پھٹ گیا تھا۔

مندرجہ بالا معلومات کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ پہاڑوں کی تشکیل پہلے بھی سطح زمین کی حرکت اور زلزلوں کے باعث ہوئی تھی اور آج بھی اسی طرح ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ زلزلوں کی صورت میں سامنے آتا ہے سطح ارضی کی تہیں جب ایک دوسرے سے رگڑ کھاتی ہیں تو زلزلے آتے ہیں۔ اسی طرح آتش فشاں بھی زلزلے کا سبب بنتے ہیں۔

لیکن یہ بات بھی واضح ہے کہ محمد ﷺ کے پیروکاروں کے لیے ان آیات کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے پہاڑوں کو زمین میں گاڑا ہے، میخوں کی مانند یا لنگر کی طرح، تاکہ زمین حرکت نہ کرے اور مستحکم رہے۔ پہاڑوں کو زمین میں گاڑے جانے کی بات تو شاید شاعرانہ ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ پہاڑ زمین کو کانپنے سے بچاتے ہیں، یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے کیوں کہ یہ

بات جدید سائنس کی رُو سے غلط ہے۔

اب ہم مختصراً اس بات کا جائزہ لیں گے کہ قرآن سورج کے بارے میں ہمیں کیا بتاتا ہے؟

سورۂ کہف میں کہا گیا ہے:

﴿ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝ ﴾ [الكهف : ٨٦]

''حتیٰ کہ جب وہ غروبِ آفتاب کی حد تک پہنچ گیا، تو اس نے سورج کو ایک کالے پانی میں ڈوبتے دیکھا اور وہاں اسے ایک قوم ملی۔ ہم نے کہا: اے ذوالقرنین! تجھے یہ مقدرت بھی حاصل ہے کہ ان کو تکلیف پہنچائے اور یہ بھی کہ ان کے ساتھ نیک رویہ اختیار کرے۔''

پھر سورۂ فرقان میں یہ بھی کہا گیا:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۝ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ۝ ﴾

[الفرقان : ٤٦ـ٤٥]

''تم نے دیکھا نہیں کہ تمھارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا، پھر (جیسے جیسے سورج اٹھتا جاتا ہے) ہم اس سائے کو رفتہ رفتہ اپنی طرف سمیٹتے جاتے ہیں۔''

اگر ہم اس طرح سوچیں کہ جب سورج ہمارے سر پر ہوتا ہے تو سایہ نہیں ہوتا یا نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے لیکن جوں جوں سورج آگے بڑھتا ہے اس کے مخالف سمت میں سایہ طویل تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

لیکن بات یہ ہے کہ سورج تو زمین کے لحاظ سے ساکن ہے۔ زمین کی گردش درحقیقت سائے کے گھٹنے یا بڑھنے کا سبب بنتی ہے۔ گویا زمین کی حرکت سائے کو گھٹانے بڑھانے کا

سبب بنتی ہے۔

اب میں ایک مختلف موضوع کی طرف آتا ہوں۔ قرآن میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا واقعہ بیان ہوا ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کی وفات کا جنّوں کو پتہ اس وقت چلا جب ان کے عصا کو گھن لگ گیا۔ اور وہ گر پڑے۔

گویا صورتِ حال یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں لیکن ان کا جسم عصا کے سہارے کھڑا ہے۔ کوئی باورچی ان کے پاس نہیں آتا کہ پوچھے؛ حضرت آج کیا کھائیں گے۔ کوئی جنرل احکامات لینے نہیں آتا۔ کوئی درباری آ کر یہ نہیں کہتا کہ شکار پر چلیں۔ میرے لیے یہ کہانی ناقابل یقین ہے کیوں کہ بادشاہ کو کبھی بھی اس طرح اکیلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔

اب ہم ذرا ''دودھ'' کا جائزہ لیتے ہیں۔ سورۂ نحل میں کہا گیا ہے:

﴿ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ ﴾ [النحل: ٦٦]

''اور تمھارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم تمھیں ایک چیز پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔''

پیٹ میں سے؟ جہاں آنتیں ہوتی ہیں؟ معاف کیجیے گا۔ بیسویں صدی کے علم طب کے مطابق Mammary Glands جن میں دودھ بنتا ہے، ان کا آنتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اب ہم آتے ہیں ایک اور موضوع کی جانب۔ سورۂ انعام میں کہا گیا ہے:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝ ﴾

[الانعام: ۳۸]

''زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی

پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمھاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔''

اس آیت میں یہ کہا جارہا ہے کہ ہر جانور اور ہر پرندے کا تعلق ہم انسانوں جیسی انواع سے ہے۔ بعض مکڑیوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ نر مکڑی کو مادہ مکڑی کھا جاتی ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میری بیوی مجھے نہیں کھائے گئی۔ اسی طرح شہد کی مکھیوں میں بھی ضرورت سے زاید نر مکھیوں کو چھتے سے نکال دیا جاتا ہے۔ شکر ہے کہ میری بیوی نے مجھے گھر سے باہر نہیں نکال دیا۔ اسی طرح شیروں میں جب ایک نر شیر بوڑھا ہو جاتا ہے تو جوان شیر اسے بھگا دیتے ہیں۔ اور اس کے بچوں کو مار دیتے ہیں۔

لہٰذا میں یہ نہیں سمجھتا کہ دیگر تمام جانور بھی نوعِ انسانی کی طرح رہتے ہیں۔

نتیجتاً میں کہوں گا کہ یہ واضح ہے کہ قرآن میں بہت سی سائنسی غلطیاں موجود ہیں۔[1]

عمومی طور پر قرآن اپنے دور کی علمی سطح کے مطابق ہے اور اس کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ یعنی ساتویں صدی عیسوی کی علمی سطح۔

ہم آج یہاں حق کی تلاش میں جمع ہوئے ہیں۔ میں نے اپنی استطاعت کی حد تک مصدقہ معلومات پیش کی ہیں۔ اگر آپ مکمل حوالے دیکھنا چاہیں تو وہ میری کتاب؛

"The Quran and the Bible, in the light of History & Science."

میں موجود ہیں۔

سچائی کا خدا آپ کی رہنمائی کرے۔

شکریہ

☆............☆............☆

---

(۱) نقل کفر، کفر نہ باشد۔

خطاب

ڈاکٹر ذاکر نائیک

محترم ڈاکٹر ولیم کیمپبل صاحب، ڈاکٹر مارکوس، ڈاکٹر جمال، سیموئیل نعمان، ڈاکٹر محمد نائیک اور میرے عزیز بھائیو اور بہنو، میں آپ سب کو اسلامی طریقہ سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ!

میں دعا کرتا ہوں کہ آپ سب پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔

ہماری آج کی گفتگو کا موضوع ہے:

''قرآن اور بائبل جدید سائنس کی روشنی میں''

قرآنِ مجید وحی کی آخری اور مکمل صورت ہے جو اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔ ہر وہ کتاب جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ وہ منزل من اللہ ہے اسے وقت کی آزمائش پر پورا اترنا چاہیے۔

دور گزشتہ کو دیکھا جائے تو وہ زمانہ معجزات کا زمانہ تھا۔ الحمدللہ قرآنِ پاک معجزوں کا معجزہ ہے۔ اس کے بعد وہ دور آیا جسے ادب اور شاعری کا دور کہنا چاہیے اور کیا مسلم کیا غیر مسلم، سب اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن روئے زمین پر عربی ادب کا بہترین نمونہ ہے۔ لیکن آج کا دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ قرآن جدید سائنس سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟

البرٹ آئن سٹائن نے کہا تھا:

''مذہب سائنس کے بغیر لنگڑا ہے اور سائنس مذہب کے بغیر اندھی ہے۔''

سب سے پہلے تو میں آپ کو یاد کرانا چاہوں گا کہ قرآنِ مبین سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ گویا یہ سائنس (Science) کی کتاب نہیں ہے بلکہ نشانیوں (Signs) کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں چھ ہزار سے زیادہ نشانیاں یعنی آیات ہیں جن میں تقریباً ایک ہزار ایسی ہیں جن کا تعلق سائنس سے ہے۔

سائنس اور قرآن کے حوالے سے جہاں تک میری گفتگو کا تعلق ہے تو میں اسے صرف ایسے سائنسی حقائق تک محدود رکھوں گا جو ثابت شدہ ہوں۔ میں ان سائنسی نظریات کے بارے میں بات نہیں کروں گا جن کی حیثیت محض مفروضوں اور اندازوں سے زیادہ نہیں، جن کا کوئی ثبوت موجود نہیں، کیوں کہ ہم سب جانتے ہیں کہ سائنس بعض اوقات پلٹا بھی کھا جاتی ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے ڈاکٹر موریس بوکائیے کی کتاب ''بائبل، قرآن اور سائنس'' کے جواب میں ''بائبل اور قرآن، تاریخ اور سائنس کی روشنی میں'' لکھی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ دو طریقہ ہائے کار موجود ہیں۔ ایک تطبیق کا طریقہ کار ہے جس کے تحت ایک شخص سائنسی نظریات اور مذہبی بیانات میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسرا طریقہ کار اختلاف کا ہے یعنی سائنس اور مذہب کے مابین اختلاف کو سامنے لایا جائے۔ (اور ایک کی روشنی میں دوسرے کو غلط قرار دیا جائے۔)

جیسا کہ محترم ڈاکٹر کیمپبل نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔

لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اس سے قطع نظر کہ کوئی شخص تطبیق کا طریقہ اختیار کرتا ہے یا تردید کا، اگر آپ منطقی دلائل کی روشنی میں اور منطقی طریقہ کار کے تحت آگے بڑھتے ہیں تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوگا جو قرآن کے کسی ایک بیان کو بھی جدید سائنس کی روشنی میں غلط ثابت کر سکے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے جدید سائنس کی روشنی میں قرآن میں متعدد نام نہاد غلطیوں کی

نشان دہی کی ہے، جن کا جواب مجھے تقریب کے دوسرے حصے میں یعنی ...... جوابی خطاب میں دینا ہے۔ لیکن چوں کہ انھوں نے پہلے گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا تھا لہٰذا ان کے چند نکات کا جواب میں اسی گفتگو کے دوران دوں گا۔ ان کی گفتگو کا بیش تر حصہ علم الجنین اور ارضیات سے متعلق تھا، لہٰذا اس حوالے سے ان کے اعتراضات کا جواب میں ابھی دے دوں گا جب کہ باقی ماندہ اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش میں ان شاء اللہ اپنی جوابی گفتگو میں کروں گا۔

بات یہ ہے کہ ہمارا موضوع ''قرآن اور بائبل، سائنس کی روشنی میں'' ہے۔ لہٰذا یہ مناسب نہیں ہے کہ میں ایک ہی کتاب مقدسہ کے بارے میں بات کروں۔ یہ موضوع سے انصاف نہیں ہوگا۔ میں قرآن اور بائبل دونوں کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کروں گا۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے بائبل کے بارے میں مشکل سے ایک دو باتیں ہی کی ہیں۔ انشاء اللہ میں اس بارے میں مفصل بات کروں گا۔ کیوں کہ میں موضوع سے انصاف کرنا چاہتا ہوں، جہاں تک قرآن اور جدید سائنس کا تعلق ہے، ہم بات کا آغاز فلکیات سے کریں گے۔ چند دہائیاں پیش تر سائنسدانوں اور ماہرین فلکیات نے ہمیں بتایا کہ کائنات کس طرح وجود میں آئی۔ وہ اس نظریے کو ''عظیم دھماکہ'' یا Big Bang کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ ایک Primary Nebula بہت بڑے دھماکے کے ساتھ پھٹا اور اس کے نتیجے میں کہکشائیں اور اجرام فلکی وجود میں آئے۔ یعنی ستارے، سورج، چاند اور وہ زمین بھی جس پر آج ہم رہ رہے ہیں۔ یہ ساری معلومات قرآن میں نہایت اختصار کے ساتھ بیان کردی گئی ہیں۔

سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء: ۳۰]

''کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبی ﷺ کی بات ماننے سے) انکار کردیا ہے،

غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ (ہماری اس خلّاقی کو) نہیں مانتے؟''

ذرا تصور کیجیے، یہ بات حال ہی میں ہمارے علم میں آئی ہے لیکن قرآن میں یہ بات آج سے چودہ سو سال پہلے ہی بیان کی جا چکی تھی۔ جب میں سکول میں تھا تو ہمیں بتایا جاتا تھا کہ سورج ساکن ہے جب کہ زمین اور چاند اپنے مداروں میں سورج کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ یعنی چاند اور زمین تو اپنے مداروں میں متحرک ہیں مگر سورج ایک مقام پر ساکن ہے۔ لیکن قرآنِ مجید کی ایک آیت میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء: ۳۳]

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔''

یعنی ہر کوئی اپنے اپنے فلک میں، اپنے اپنے مدار میں حرکت کر رہا ہے۔ الحمدللہ آج جدید سائنس بھی اس آیت قرآنی کی تصدیق کر چکی ہے۔ قرآن میں اس مقام پر جو عربی لفظ استعمال ہوا ہے وہ ہے ﴿ يُسَبِّحُوْنَ ﴾۔ یہ لفظ ایک ایسے جسم کی حرکت ظاہر کرتا ہے جو اپنے مقام پر بھی متحرک ہو۔ گویا جہاں اجرامِ فلکی کا ذکر ہو وہاں یہ لفظ اپنے مرکز کے گرد حرکت کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

پس قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ چاند اور سورج اپنے مرکز کے گرد بھی گھومتے ہیں اور اپنے اپنے مداروں میں بھی تیر رہے ہیں۔ آج جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ سورج تقریباً ۲۵ دن میں اپنے مرکز کے گرد ایک چکر پورا کر لیتا ہے۔

ایڈون ہبل وہ سائنس دان تھا جس نے پہلی بار یہ حقیقت دریافت کی کہ ہماری کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔ لیکن قرآنِ مجید کی سورۂ ذاریات میں فرمایا گیا ہے:

﴿ وَالسَّمَآءَ بَنَيۡنٰهَا بِاَيۡدٍ وَّاِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ٥ ﴾ [الذّٰریٰت : ٤٧]

''آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اسے وسیع کرنے والے ہیں۔''

یہاں کائنات کے پھیلنے کا ذکر ہے، عربی کے لفظ ﴿ مُوۡسِعُوۡنَ ﴾ کا مطلب ہے وسعت دینے والا، وسیع کرنے والا۔

فلکیات کے حوالے سے جن باتوں کا ذکر ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے کیا ہے ان کا جواب میں اپنی جوابی گفتگو کے دوران میں ہی دوں گا۔ ان شاء اللہ۔

جہاں تک ''آبی چکر'' کا تعلق ہے ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے اپنی گفتگو میں چار مراحل کا حوالہ دیا ہے۔ جب کہ اپنی کتاب میں وہ چوتھے مرحلے کا (a) اور (b) دو حصوں میں ذکر کرتے ہیں۔ آخری مرحلے کا ذکر انھوں نے اپنی گفتگو میں نہیں کیا۔ پتہ نہیں کیوں ......

یہ مرحلہ Driplination کہلاتا ہے، شاید انھوں نے اس لیے اس کو نظر انداز کر دیا ہوگا کہ اس کا ذکر بائبل میں موجود نہیں ہے۔

وہ کہتے ہیں قرآن کی کسی آیت میں بھی بخارات بننے کے عمل کا ذکر نہیں ہے۔ قرآن آبی چکر کے بارے میں ہمیں بڑی وضاحت سے بتاتا ہے۔ سورۃ الطارق میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ٥ ﴾ [الطارق : ١١]

''اور قسم ہے پلٹانے والے آسمان کی۔''

تقریباً تمام مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں اس آیت میں جو رجوع یا پلٹانے کی بات کی گئی ہے اس سے مراد بارش کو پلٹانے یا بخارات کی صورت میں پانی کے بادلوں میں تبدیل ہونے کی حقیقت ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل جو عربی جانتے ہیں، اس موقع پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یہ بات واضح الفاظ میں بیان کیوں نہیں کی؟ صاف صاف الفاظ میں یہ کیوں نہیں کہا کہ آسمان بخارات کو بارش کی صورت میں پلٹا دیتا ہے؟

لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے یوں کیوں نہیں فرمایا؟ اسی میں حکمت تھی کیوں کہ آج ہمیں یہ علم ہوا ہے کہ زمین کے اوپر موجود فضائی سطح (Ozonosphere) نہ صرف بخارات اور بادلوں کو بارش کی صورت میں زمین کی طرف پلٹاتی ہے بلکہ زمین سے اوپر جانے والی فایدہ مند حرارت اور قوت کو بھی واپس پلٹاتی ہے جو کہ انسانیت کے لیے فایدہ مند ہیں۔

آج ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سطح ریڈیو، ٹی وی وغیرہ کی نشریاتی لہروں کو پلٹانے کا بھی سبب بنتی ہے۔

مزید برآں یہ سطح یعنی Ozonosphere بیرونی خلا سے آنے والی نقصان دہ شعاعوں کو روکنے اور پلٹانے کا سبب بھی بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر سورج سے آنے والی بالا بنفشی شعاعیں، جنھیں اوزون کی سطح جذب کر لیتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو زمین پر حیات ختم ہو سکتی ہے۔

لہٰذا اللہ سبحانہ وتعالیٰ عظیم ہے اور بالکل بجا طور پر ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ○ ﴾ [الطارق : ۱۱]

''اور قسم ہے پلٹانے والے آسمان کی۔''

دیگر باتیں جن کا انھوں نے ذکر کیا ہے، وہ بھی قرآن میں موجود ہیں۔ تفصیل کے لیے آپ میری ویڈیو کیسٹ دیکھ سکتے ہیں۔[1] قرآن تو آبی چکر کا ذکر بڑی وضاحت کے ساتھ کرتا ہے۔

جہاں تک بائبل میں آبی چکر کے ذکر کا تعلق ہے، تو انھوں نے پہلے تو آبی چکر کے پہلے اور تیسرے مرحلے کا حوالہ دیا اور بعد ازاں پہلے، تیسرے اور دوسرے مرحلے کا۔ انھوں نے کہا کہ پانی اوپر جاتا ہے اور بارش کی صورت میں دوبارہ زمین پر آتا ہے۔ یہ ملی ٹس کا فلسفہ ہے جو کہ ساتویں صدی قبل مسیح کا فلسفی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سمندر کی سطح سے بخارات

---

(۱) ڈاکٹر صاحب کی اس تقریر کا اُردو ترجمہ ''قرآن اور سائنس'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ (ناشر)

کو ہوا اٹھا کر لے جاتی ہے جو بعدازاں بارش کی صورت میں برستے ہیں۔ اس فلسفے میں بادلوں کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

دوسرا حوالہ جو ڈاکٹر کیمپبل نے دیا، اس میں پہلی بات یہ کی گئی کہ پانی بخارات میں تبدیل ہوتا ہے، ہم اس بات سے اتفاق کرتے ہیں، ہمیں بائبل کے ساتھ تطبیق کا رویہ اختیار کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس کے بعد بارش کا ذکر ہے اور پھر دوبارہ بادلوں کا۔ یہ سب بجا لیکن یہ مکمل آبی چکر نہیں ہے۔

الحمدللہ قرآن اس آبی چکر کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے اور وہ بھی متعدد مقامات پر۔ بادلوں کا بننا، ان کی حرکت، ان کا برسنا اور پھر پانی کی دوبارہ بخارات میں تبدیلی، ان سب مراحل کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔

مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی میں ہمیں آبی چکر کا ذکر ملتا ہے۔

سورۂ نور، آیت: ۴۳	سورۂ روم، آیت: ۴۸
سورۂ الزمر، آیت: ۲۱	سورۂ مومنون، آیت: ۱۸
سورۂ روم، آیت: ۲۴	سورۂ حجر، آیت: ۲۲
سورۂ اعراف، آیت: ۵۷	سورۂ رعد، آیت: ۱۷
سورۂ الفرقان، آیات: ۴۹ - ۴۸	سورۂ فاطر، آیت: ۹
سورۂ جاثیہ، آیت: ۵	سورۂ ق، آیت: ۹
سورۂ واقعہ، آیات: ۶۸ تا ۷۰	سورۂ الملک، آیت: ۳۰

قرآنِ مجید کی مندرجہ بالا تمام آیاتِ کریمہ میں آبی چکر Water Cycle کا ذکر موجود ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے اپنی گفتگو کا بیش تر وقت علم الجنین Embryology کے حوالے سے گفتگو میں صرف کیا ہے۔ میں نے نوٹ کیا تھا۔ ان کی تقریباً نصف گفتگو علم الجنین سے متعلق تھی۔ اس کے بعد انھوں نے ارضیات کے حوالے سے نسبتاً زیادہ گفتگو کی اور پھر چھ

دیگر موضوعات کے حوالے سے سرسری گفتگو کی۔

جہاں تک ارضیات کا تعلق ہے، جدید ماہرین ارضیات ہمیں بتاتے ہیں کہ زمین کا قطر تقریباً تین ہزار سات سو پچاس میل ہے، زمین کی سب سے باہری سطح ٹھنڈی ہے لیکن اندرونی پرتیں انتہائی گرم اور پگھلی ہوئی حالت میں ہیں، جہاں زندگی کا کوئی امکان موجود نہیں۔ اور یہ کہ زمین کی سب سے بیرونی پرت جس پر ہم آباد ہیں، نسبتاً انتہائی باریک ہے، اس کی موٹائی ایک میل سے لے کر ۳۰ میل تک ہے، چند حصے نسبتاً زیادہ موٹے ہوسکتے ہیں لیکن عموماً یہ پرت ایک سے تیس میل کے درمیان ہی ہوتی ہے۔

اس پرت یا سطح کے ''ہلنے'' کے قوی امکانات موجود رہتے ہیں جس کی ایک وجہ ''بل پڑنے کا عمل'' ہے، جس کے نتیجے میں پہاڑ بنتے ہیں اور زمین کی سطح کو استحکام ملتا ہے۔ قرآن کی سورۂ نبا میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۝ وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۝ ﴾ [النباء: ٧-٦]

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخیں۔''

قرآن یہ نہیں کہتا کہ پہاڑوں کو میخوں کی طرح زمین میں اوپر سے گاڑا گیا ہے بلکہ یہ کہ پہاڑوں کو میخوں کی طرح بنایا گیا ہے۔ اوتاداً کا مطلب خیمے گاڑنے والی میخیں ہی ہوتا ہے۔ آج جدید علم ارضیات بھی اس بات کی تائید کرتا ہے کہ پہاڑوں کی جڑیں زمین میں گہرائی تک ہوتی ہیں۔ یہ بات انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں سامنے آئی تھی کہ پہاڑ کا بیش تر حصہ زمین کے اندر ہوتا ہے اور صرف تھوڑا سا حصہ ہمیں نظر آتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے زمین میں گڑی ہوئی میخ کا بیش تر حصہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ یا جس طرح ''آئس برگ'' کی صرف چوٹی ہمیں نظر آتی ہے جب کہ ۹۰ فی صد حصہ پانی کے اندر ہوتا ہے۔

سورۂ غاشیہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ ﴾ [الغاشیہ: ١٩]

''اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے؟''

ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالْجِبَالَ أَرْسٰهَا ﴾ [النازعات: ۳۲]

''اور پہاڑ اس میں کھڑے کر دیے۔''

جدید ارضیاتی نظریے اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ پہاڑی سلسلے سطح زمین کو استحکام فراہم کرتے ہیں۔ تمام ماہرین ارضیات نہیں لیکن کئی ماہرین یہی کہتے ہیں۔ میں ڈاکٹر ولیم کیمپبل کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ علم ارضیات کی کسی ایک مستند کتاب میں وہ بات دکھا دیں جو انھوں نے کی۔ اور میں مستند کتاب کا ذکر کر رہا ہوں۔ ان کی ''ذاتی خط و کتابت'' کا نہیں۔ دستاویزی ثبوت مانگ رہا ہوں۔

دوسری طرف ایک کتاب ہے جس کا نام ہے ''زمین'' (Earth)۔ یہ کتاب بیش تر یونیورسٹیوں کے ارضیات کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کتاب کے مصنفین میں ڈاکٹر فرینک پریس بھی شامل ہیں جو سابق امریکی صدر جمی کارٹر کے مشیر رہ چکے ہیں اور امریکہ کی اکیڈمی آف سائنسز کے بھی صدر رہے ہیں۔ وہ اس کتاب میں کہتے ہیں کہ پہاڑ مثلث نما ہوتے ہیں، زمین کے اندر گہرائی تک ان کی جڑیں ہوتی ہیں اور یہ کہ پہاڑ زمین کو استحکام فراہم کرتے ہیں۔

جب قرآن کہتا ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَ جَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴾ [الانبیاء: ۳۱]

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں۔''

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَأَلْقٰى فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ ﴾ [لقمٰن: ۱۰]

’’اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں۔ اس نے زمین میں پہاڑ جما دیے، تا کہ وہ تمھیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔‘‘

﴿ وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ ﴾ [النحل: ۱۵]

’’اس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تا کہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے، اس نے دریا جاری کیے اور قدرتی راستے بنائے، تا کہ تم ہدایت پاؤ۔‘‘

گویا قرآن میں بھی پہاڑوں کا مقصد یہی بتایا گیا ہے کہ وہ سطح زمین کو استحکام فراہم کرتے ہیں۔ قرآن کی ان آیات میں یہ کہیں بھی نہیں کہا گیا کہ پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے اپنی کتاب میں یہ بات لکھی ہے اور اپنی گفتگو میں بھی کہا ہے کہ پہاڑی علاقوں میں زلزلے زیادہ آتے ہیں اور یہ کہ پہاڑ زلزلوں کا باعث بنتے ہیں۔

یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن میں یہ تو کہیں نہیں کہا گیا کہ پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں۔ عربی میں زلزلے کے لیے ’’زلزال‘‘ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کیمپبل چوں کہ عربی جانتے ہیں لہٰذا یہ بات ان کے بھی علم میں ہوگی۔ لیکن ان تینوں آیات میں، جن کا میں نے حوالہ دیا، کہیں بھی زلزلے کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ ان میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ہے ’’تَمِیدًا ‘‘جس کے معنی ’’ڈھلکنے‘‘ یا ’’جھولنے‘‘ کے ہوتے ہیں اور قرآن ان تینوں آیات میں یہی لفظ استعمال کرتا ہے کہ زمین تمھیں لے کر ڈھلک نہ جائے، جھول نہ پڑے۔ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین حرکت کرتی۔ یہی بات قرآن میں کہی گئی ہے اور یہی بات ڈاکٹر فرینک پریس کر رہے ہیں۔ یہی بات ڈاکٹر نجات لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر نجات کا تعلق سعودی عرب سے ہے اور انھوں نے قرآن کے ارضیاتی تصورات پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اور یہ کتاب ڈاکٹر ولیم کیمپبل کے جملہ اعتراضات کے تفصیلی جوابات فراہم کر دیتی ہے۔

یعنی ڈاکٹر ولیم کیمپبل کا کہنا یہ تھا کہ اگر پہاڑ زمین کو کانپنے سے روکتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ پہاڑی علاقوں میں زلزلے زیادہ آتے ہیں؟

اور میرا جواب یہ ہے کہ نہیں، قرآن میں کہاں لکھا ہوا ہے کہ پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں؟ زلزلے کو عربی میں زلزال کہتے ہیں۔ آکسفرڈ ڈکشنری میں زلزلے کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے:

Earthquake is due to convulsion of the superficial crust of the earth, due to relief of compressed siesmic waves, due to a crack in the rock or due to volcanic reaction.

زلزلے یا بھونچال کا ذکر قرآن سورۂ زلزال میں کرتا ہے، لیکن یہاں زلزال کا لفظ استعمال نہیں ہو رہا بلکہ تمید بکم کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی ڈولنے یا ڈھلکنے کا ذکر ہے۔

اسی طرح جہاں تک اس بیان کا تعلق ہے:

''اگر پہاڑ زلزلوں کو روکتے ہیں تو پھر پہاڑی علاقوں میں ہی زیادہ زلزلے کیوں آتے ہیں؟''

تو اس بات کا جواب دینے کے لیے میں ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ فرض کیجیے میں کہتا ہوں کہ ڈاکٹر حضرات انسانوں کو لاحق ہونے والی بیماریوں اور امراض کا علاج کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص مجھ پر اعتراض کرتے ہوئے کہے کہ اگر ڈاکٹر بیماریوں کو ٹھیک کرتے ہیں تو پھر زیادہ مریض ہسپتالوں میں کیوں پائے جاتے ہیں جہاں زیادہ تعداد میں ڈاکٹر موجود ہوتے ہیں، بہ نسبت گھروں کے، جہاں ڈاکٹر نہیں ہوتے؟ تو کیا اس معترض کا استدلال درست ہوگا؟

اب ہم سمندروں کے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ

﴿وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ٥﴾ [الفرقان : ۵۳]

''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے، ایک لذیذ وشیریں دوسرا تلخ وشور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو انھیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

اسی طرح قرآن مجید کی سورۂ رحمان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ٥ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ ٥﴾

[الرحمن: ۱۹، ۲۰]

''دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔''

قدیم مفسرین قرآن کے اس مقام کی وضاحت کرتے ہوئے بڑے پریشان ہوتے تھے کہ اس آیت کا کیا مفہوم بیان کریں۔ انھیں کڑوے اور میٹھے پانی کا تو علم تھا لیکن یہ کہ ایسی کوئی رکاوٹ ہے یا پردہ ہے جو انھیں آپس میں حل نہیں ہونے دیتا، اس بات کی وضاحت ان کے لیے مشکل تھی۔

لیکن آج علم بحریات ترقی کر چکا ہے، لہٰذا ہم جانتے ہیں کہ جب ایک قسم کا پانی دوسری قسم کے پانی کے ساتھ ملتا ہے تو دونوں کے اجزاء ایک دوسرے میں حل ہوتے ہیں اور یوں ایک طرح کا محلول تیار ہوتا ہے، یہ یکساں محلول، جس میں دونوں طرح کے پانی کی خصوصیات موجود ہوتی ہیں، لیکن یہ دونوں طرح کے پانیوں کو الگ الگ بھی رکھتا ہے۔ قرآن اس کے لیے ''برزخ'' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ اس بات پر متعدد بڑے سائنس دانوں کا اتفاق رائے ہے۔ جن میں امریکہ کے ایک سائنس دان Dr, Hay بھی شامل ہیں جو کہ بحری علوم کے ماہر ہیں۔

ڈاکٹر ولیم کیمبل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ یہ تو ایک عام سی بات ہے۔ اور اُس دور کے ماہی گیر بھی جانتے تھے کہ دو طرح کا پانی ہوتا ہے میٹھا اور کڑوا۔ اور حضرت محمدﷺ اپنے سفر

شام کے دوران میں سمندری سفر کے ذریعے یا ان ماہی گیروں کے ساتھ گفتگو کے ذریعے اس صورتِ حال سے آگاہ ہو سکتے تھے۔

اب ہم آتے ہیں علم الجنین والے معاملے کی جانب۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل کی گفتگو کا نصف سے زیادہ حصہ اسی موضوع سے متعلق تھا۔ وقت مجھے اتنی اجازت نہیں دیتا کہ میں ان کی ہر غیر منطقی بات کا جواب دے سکوں۔ لہٰذا میں مختصر جواب دوں گا، مزید تفصیل کے لیے آپ میری کتاب ''قرآن اور جدید سائنس'' اور اس موضوع پر میری تقاریر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل چند عربوں نے علم الجنین سے متعلق قرآن مجید اور احادیث نبویہ کو اکٹھا کیا اور یہ سارا لوازمہ انھوں نے کینیڈا ڈاکٹر کیتھ مور کو پیش کر دیا جو یونیورسٹی آف ٹورانٹو، کینیڈا میں اس شعبہ کے سربراہ ہیں اور دورِ حاضر میں ان کا شمار علم الجنین کے بڑے ماہرین میں ہوتا ہے۔ ان آیات و احادیث کے تراجم کا مطالعہ کرنے کے بعد جب ان سے تبصرے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے کہا کہ ان میں سے بیش تر آیات اور احادیث تو جدید ترین تحقیقات سے مکمل مطابقت رکھتی ہیں۔ البتہ چند باتیں ایسی ہیں جنھیں نہ وہ درست قرار دے سکتے ہیں اور نہ ہی غلط کہہ سکتے ہیں کیوں کہ جدید سائنس نے ابھی تک ان کی مکمل وضاحت ہی نہیں کی۔ یعنی انھوں نے کہا کہ وہ خود ان کے بارے میں مکمل علم نہیں رکھتے۔ اور ان میں دو آیات وہ تھیں جو ترتیب نزولی کے اعتبار سے قرآن کی اوّلین آیات ہیں:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ٥ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ٥﴾

[العلق: ۲،۱]

''پڑھو! (اے نبیؐ!) اپنے رب کے نام کے ساتھ، جس نے پیدا کیا جس نے ''علقہ'' سے انسان کی تخلیق کی۔''

''علق'' سے مراد کوئی چپکنے والی چیز یا جونک نما چیز ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر ولیم کیمپبل کے اس بیان کا تعلق ہے کہ ہمیں کسی کتاب کا مطالعہ

کرتے ہوئے الفاظ کے وہی معنی سامنے رکھنے چاہئیں جو اس وقت مراد لیے جاتے تھے جب کتاب تحریر ہوئی تھی۔ یا وہی معنی قبول کرنے چاہئیں جو معنی اوّلین مخاطبین کے نزدیک درست تھے۔

میں ڈاکٹر کیمپبل کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں لیکن صرف بائبل کے معاملے میں۔ بائبل کے حق میں تو ان کی یہ بات بالکل درست ہے کیونکہ بائبل ایک ایسی کتاب ہے جس کے مخاطبین صرف اس دور کے لوگ تھے۔ بلکہ صرف بنی اسرائیل تھے۔ یہ بات بائبل میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔ بارہ حواریوں کے نام بیان کرنے کے بعد تحریر ہے:

''ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور ان کو حکم دے کر کہا: ''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔'' [متی۔ باب ۱۰۔ ۶،۷]

یہاں انھیں غیر قوموں کی طرف جانے سے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام منع کر رہے ہیں۔ غیر قوموں سے کیا مراد ہے؟ غیر قوموں سے مراد ہندو ہیں، مسلمان ہیں، تمام غیر یہودی اقوام ہیں۔اس طرح متی کی انجیل میں دوبارہ کہا گیا ہے:

''میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی اور کے پاس نہیں بھیجا گیا۔'' [متی۔ باب ۱۵۔۲۴]

گویا بائبل اور حضرت یسوع مسیح علیہ السلام کا پیغام ہدایت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھا اور چونکہ یہ پیغام صرف ایک قوم تک محدود تھا لہٰذا یہاں وہ معانی مراد لینا درست ہوگا جو ان لوگوں کے نزدیک تھے۔

لیکن قرآن کا معاملہ مختلف ہے۔قرآن صرف اس دور کے عربوں کے لیے نازل نہیں ہوا تھا۔قرآن کا پیغام صرف مسلمانوں کے لیے بھی نہیں ہے۔ یہ تو پوری انسانیت کے لیے پیغام ہدایت ہے۔اور ہر زمانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

سورۂ ابراہیمؑ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ﴾[ابراهيم : ٥٢]

''یہ ایک پیغام ہے سب انسانوں کے لیے۔''

اسی طرح سورۂ بقرہ میں کہا گیا:

﴿اَلْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ﴾[البقرہ : ١٨٥]

''قرآن انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔''

سورۂ زمر میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ﴾[الزمر : ٤١]

بے شک ''(اے نبیؐ!) ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کردی ہے۔''

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کا پیغام پوری بنی نوع انسانیت کے لیے ہے۔ اور حضرت محمد ﷺ کو صرف عربوں کے لیے ہدایت دے کر نہیں بھیجا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ سورۂ انبیاء میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝﴾[الانبیاء : ١٠٧]

''(اے نبیؐ!) ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

لہٰذا جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، آپ قرآنی الفاظ کے معانی کو قطعاً اس دور تک محدود نہیں کر سکتے جس دور میں یہ نازل ہوا تھا۔ کیونکہ اس کتاب کا پیغام کسی زمانے تک محدود نہیں ہے۔

(اب ہم سابقہ گفتگو کی طرف لوٹتے ہیں) عَلَق کا ایک مطلب جونک نما چیز یا چپکنے والی چیز ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کیتھ مور کہتے ہیں کہ مجھے علم نہیں تھا کہ جنین کی ابتدائی مرحلے میں جونک سے کوئی مشابہت ہوتی ہے یا نہیں۔'' لہٰذا موصوف اپنی تجربہ گاہ میں گئے اور جنین کے ابتدائی مرحلے کا خوردبین سے جائزہ لینے کے بعد اس کا تقابل جونک کی تصویر سے کیا اور وہ دونوں کے درمیان موجود حیرت انگیز مشابہت کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے آپ کو بالکل مختلف تناظر دکھایا ہے۔ان کی کتاب میں جو تصویر ہے وہ مختلف رُخ سے ہے۔اور آپ جانتے ہیں کہ ایک ہی چیز کو جب مختلف تناظر میں دیکھا جائے تو وہ خاصی مختلف محسوس ہوسکتی ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مور سے ۸۰ سوالات کیے گئے۔ ڈاکٹر کیتھ میور نے یہ بھی کہا کہ اگر یہ ۸۰ سوالات ان سے ۳۰ سال قبل کیے جاتے تو شاید وہ پچاس فی صد سوالات کا بھی جواب نہ دے پاتے۔ کیوں کہ گزشتہ تیس سال کے عرصے میں علم الجنین نے بہت زیادہ ترقی کی ہے۔اور یہ بات ڈاکٹر کیتھ مور نے ۱۹۸۰ء کی دھائی میں کی تھی۔

اب صورت یہ ہے کہ ڈاکٹر کیتھ مور کا یہ بیان تحریری صورت میں بھی دستیاب ہے اور ان کی گفتگو کی ریکارڈنگ بھی موجود ہے۔آپ وڈیو کیسٹ میں خود بھی دیکھ سکتے ہیں۔تو اب یہ بتائیے کہ ان کے اس بیان پر یقین کیا جائے گا یا ڈاکٹر کیمپبل کے ساتھ ان کی نجی گفتگو پر؟

ڈاکٹر کیتھ مور نے یہ تحقیقات ایک کتاب کی صورت میں بھی پیش کی تھیں جس کا عنوان تھا ''The Developing Human''۔اس کتاب کو اس سال کسی ایک مصنف کی لکھی ہوئی بہترین طبی کتاب کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔اس کتاب کا اسلامی ایڈیشن ڈاکٹر عبدالمجید الزندانی نے شایع کیا تھا جس پر ڈاکٹر مور کی تصدیق بھی موجود ہے۔

قرآن مجید کی سورۂ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ﴾ [المؤمنون : ۱۳]

''پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔''

سورۂ حج میں بلکہ قرآن میں گیارہ مقامات پر یہ بات کہی گئی ہے کہ انسان کی تخلیق نطفے سے ہوئی ہے۔اور نطفہ عربی زبان میں ''مایع کی انتہائی قلیل مقدار'' کو کہتے ہیں۔مثال کے طور پر وہ مقدار جو پیالے کی تہہ سے لگی رہ جاتی ہے یعنی قلیل ترین مقدار۔

آج ہم جانتے ہیں کہ مادہ منویہ میں موجود کروڑوں جرثوموں میں سے کوئی ایک بھی

جنین کی تشکیل کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اور یہ ایک نہایت ہی چھوٹی سی مقدار ہوتی ہے جس کے لیے قرآن ''نطفہ'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

قرآن مجید کی سورۂ سجدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾ [السجدہ: ۸]

''پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔''

''ست یا سلالۃ'' سے مراد ہے کسی چیز کا جوہر، کسی شے کا بہترین حصہ۔ یا یوں کہیے کہ کروڑوں جرثوموں میں سے وہ ایک جرثومہ جو بیضے کو بارآور کرنے کا باعث بنتا ہے۔ قرآن اسی لیے تو یہاں لفظ ''سلالۃ'' یعنی بہترین حصہ استعمال کرتا ہے۔

سورۂ الدھر میں مزید ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا﴾ [الدھر: ۲]

''ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔''

یہاں قرآن ''نطفةٍ امشاج'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ یعنی مخلوط نطفہ۔ گویا یہاں اشارہ بیضوں اور مادہ منویہ کی طرف ہے۔ کیونکہ جنین کی تشکیل کے لیے ان دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل کا ذکر قرآن بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ کرتا ہے۔

سورۂ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝﴾ [المؤمنون: ۱۴-۱۲]

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔''

مندرجہ بالا آیات میں بتایا گیا کہ انسان کی تخلیق ہوئی نُطفَةً سے جو مائع کی انتہائی قلیل مقدار ہے۔

پھر اسے ''قرارٍ مَّکِینٍ'' میں رکھا گیا یعنی محفوظ جگہ پھر وہ ''علقہ'' میں تبدیل ہوا یعنی ''جونک نما شے'' یا ''چپکنے والی شے'' یا ''خون کا لوتھڑا۔''

پھر علقہ کو تبدیل کیا گیا ''مضغة'' میں، یعنی چبائی ہوئی شے یا بوٹی۔

پھر مضغة سے ''عظاماً'' یعنی ہڈیاں بنائی گئیں۔

پھر ''لحم'' یعنی گوشت کی تشکیل ہوئی۔

ان تین آیات قرآنی میں جنین کے ارتقائی مراحل بڑی وضاحت سے بیان کر دیے گئے ہیں۔ سب سے پہلے تو نطفہ، قرار مکین میں پہنچتا ہے یعنی رحم مادر میں اور پھر وہ علقة میں تبدیل ہوتا ہے۔ لفظ ''علقة'' کے تین معانی ہیں: پہلا معنی تو ''چپکنے والی چیز'' ہے اور یہ معنی بالکل درست ہے کیونکہ جنین رحم کی دیوار کے ساتھ چپکا رہتا ہے۔ دوسرے معنی ''جونک نما شے'' ہیں۔ اور جیسا کہ پہلے بھی وضاحت کر چکا ہوں کہ جنین اپنے ابتدائی مراحل میں واقعی جونک سے مشابہ ہوتا ہے۔ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی اور کچھ اس لحاظ سے بھی کہ جونک کی طرح اس کی پرورش بھی خون سے ہو رہی ہوتی ہے۔

تیسرے معانی ''خون کا لوتھڑا'' بھی ہوتے ہیں اور انھی معانی پر ڈاکٹر ولیم کیمبل نے اعتراض کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ یہاں قرآن غلطی پر ہے۔ لیکن میں عرض کرنا چاہوں گا کہ قرآن ہرگز غلطی پر نہیں ہے بلکہ ڈاکٹر ولیم کیمبل غلطی پر ہیں۔ کیونکہ آج، جب علم

طب اس قدر ترقی کر چکا ہے، آج بھی ڈاکٹر کیتھ مور، یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جنین ابتدائی مراحل میں خون کے لوتھڑے کی مانند بھی نظر آتا ہے۔ آپ تصاویر کی مدد سے بھی اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ علقہ تین سے چار ہفتے کی عمر میں لوتھڑے سے مشابہ نظر آتا ہے یا نہیں؟

ڈاکٹر کیمپبل کے تمام اعتراضات کا جواب ایک جملے میں بھی دیا جا سکتا ہے اور وہ جملہ یہ ہے کہ:

''قرآن میں جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل کو ان کی شباہت کی بنا پر نام دیے گئے ہیں۔''

جنین بظاہر اسی طرح نظر آتا ہے جس طرح قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ پہلے مرحلے میں واقعی اس کی شباہت لوتھڑے، جونک یا چپکنے والی چیز کی طرح ہوتی ہے۔ پھر قرآن کہتا ہے کہ علقہ کو مضغہ میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ یعنی وہ کسی چبائی ہوئی شے کی مانند ہو جاتا ہے اور یہ بات بھی درست ہے۔ ڈاکٹر کیتھ مور نے پلاسٹک کے ایک ٹکڑے کو دانتوں سے دبا کر دیکھا۔ ڈاکٹر مور لکھتے ہیں کہ علقہ کے مضغة میں تبدیل ہونے کے بعد بھی ''چپکاؤ'' موجود رہتا ہے تقریباً ساڑھے آٹھ ماہ کی عمر تک۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن کا بیان غلط ہے۔ قرآنی بیان بالکل درست ہے کیونکہ ''جیسا کہ میں نے پہلے کہا، قرآن نے یہ نام جنین کی ظاہری صورت کی بنا پر دیے ہیں، بے شک جنین تقریباً آخر تک ''چپکنے والی شے'' رہتا ہے لیکن اس کی ظاہری شباہت ''جونک نما چیز'' کی بجائے ''چبائی ہوئی چیز'' جیسی ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ''عِظَامًا'' یعنی ہڈیاں اور پھر ''لَحْمًا'' یعنی گوشت کی تشکیل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کیمپبل کا کہنا ہے کہ ہڈیوں اور پٹھوں کی تشکیل بیک وقت ہوتی ہے۔ میں ان سے اتفاق کرتا ہوں۔ واقعی اسی طرح ہوتا ہے۔

آج علم الجنین کی جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ہڈیوں اور پٹھوں کی ابتدائی تشکیل

پچیسویں سے چالیسویں دن کے درمیان ہوتی ہے۔ اور بظاہر ایک ڈھانچے کی صورت نظر آنا شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن پٹھوں یعنی گوشت کی تشکیل مکمل نہیں ہوئی ہوتی۔ یہ ساتویں اور آٹھویں ہفتے میں مکمل ہوتی ہے۔ جب کہ ہڈیاں بیالیسویں دن تک مکمل ہو چکی ہوتی ہیں، ڈھانچہ بن چکا ہوتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ قرآنی ترتیب بالکل درست ہے۔

یعنی سب سے پہلے **علقہ** پھر **مضغۃ** پھر **عظاماً** اور پھر **لحماً** قرآن کی بیان کردہ ترتیب ہی درست ترتیب ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مور کا کہنا ہے کہ جدید علم الجنین کے بیان کردہ مراحل یعنی پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا اور پانچواں مرحلہ اور ان کی تفاصیل انتہائی پیچیدہ اور عسیر الفہم ہیں۔ جب کہ صورت اور شباہت کی بنیاد پر بیان کردہ قرآنی مراحل سادہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر کیتھ مور کہتے ہیں کہ ''مجھے یہ بات ماننے پر کوئی اعتراض نہیں کہ محمدؐ خدا کے پیغمبر تھے کیونکہ قرآن مجید ایک الہامی کتاب ہی ہو سکتی ہے۔'' یعنی یہ معلومات کسی ایسی کتاب میں ہی ہو سکتی ہیں جو منزل من اللہ ہو۔

قرآن مجید کی سورۂ نساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ [النساء: ٥٦]

''جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا، انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے، تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔''

اس آیت کا تعلق ''درد کے احساس'' سے ہے۔ پہلے ڈاکٹر حضرات کا خیال تھا کہ درد کے احساس کا تعلق صرف دماغ کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن آج ہم یہ جانتے ہیں کہ درد کا

احساس صرف دماغ کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ ہماری جلد میں بھی ایسے ''Receptors'' موجود ہوتے ہیں جو درد اور تکلیف کا احساس پیدا کرتے ہیں، انھیں Pain Receptors کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے کہ انکار کرنے والوں یعنی کفار کو آگ کے حوالے کیا جائے گا اور جب ان کی کھال جل جائے گی تو ان کے جسم پر نئی کھال پیدا کر دی جائے گی تاکہ انھیں دوبارہ درد کا احساس ہو سکے۔

اس آیت سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ جلد میں ایسی کوئی خصوصیت موجود ہے جس کی وجہ سے درد کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی قرآن اس آیت میں Pain Receptors کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

تھائی لینڈ کی چانگ مائی یونیورسٹی کے شعبہ اناٹومی کے سربراہ پروفیسر تھاگاڈا شان صرف اس ایک آیت کی وجہ سے مسلمان ہو چکے ہیں۔ ریاض، سعودی عرب میں ہونے والی آٹھویں میڈیکل کانفرنس میں انھوں نے اعلان کیا:

أَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا ﷺ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

''میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے پیغامبر ہیں۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴾ [حٰم السجدہ: ۵۳]

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔''

ڈاکٹر تھاگاڈا کے لیے ایک ہی نشانی حق کی نشان دہی کے لیے کافی ہو گئی۔ یعنی اس بات پر ایمان لانے کے لیے کہ قرآن کلام خداوندی ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنھیں

دس نشانیاں درکار ہوں گی اور کچھ ایسے جنھیں سونشانیاں درکار ہوں گی۔ لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو ایک ہزار نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

ایسے لوگوں کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ [البقرہ: ١٨]

''یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب نہ پلٹیں گے۔''

بائبل بھی متی کی انجیل میں ان کے بارے میں یہی کہتی ہے۔

''میں ان سے تمثیلوں میں اس لیے باتیں کرتا ہوں کہ وہ دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے اور نہیں سمجھتے۔'' [متی باب ١٣-١٣]

جہاں تک علم الجنین سے متعلق دیگر نکات کا تعلق ہے، ان کا ذکر میں ان شاء اللہ اپنی جوابی تقریر میں کروں گا لیکن مجھے موضوع کے دوسرے حصے سے بھی انصاف کرنا ہے یعنی ''بائبل، سائنس کی روشنی میں''

سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ قرآن سے ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے:

﴿لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ ۝ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ وَ عِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝﴾ [الرعد: ٣٨-٣٩]

''ہر دور کے لیے ایک کتاب ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے، قایم رکھتا ہے، ام الکتاب اسی کے پاس ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ نے بہت سی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ لیکن نام صرف چار کا مذکور ہے۔ تورات، زبور، انجیل اور قرآن۔ تورات بھی وحی خداوندی ہے اور زبور بھی۔ انجیل وہ وحی ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور قرآن اللہ تعالیٰ کی وہ وحی ہے جو اس کے آخری پیغمبر حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے آخری وحی ہے۔

یہاں ایک بات میں واضح طور پر بیان کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ جس انجیل کو آج کل مسیحی حضرات اپنی کتاب مقدسہ قرار دیتے ہیں، ہم مسلمانوں کے نزدیک یہ وہ انجیل نہیں

جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ ہمارے خیال میں یہ ممکن ہے کہ اس انجیل میں کلامِ خداوندی بھی شامل ہو۔ لیکن اس میں دیگر کئی چیزیں بھی شامل ہیں۔ اس میں حواریوں کا کلام بھی شامل ہے۔ تاریخ دانوں کے بیانات بھی شامل ہیں اور کچھ بے معنی اور مہمل باتیں بھی۔ مزید برآں اس میں کچھ فحش بیانات اور لاتعداد سائنسی اغلاط بھی موجود ہیں۔ اگر بائبل میں کچھ باتیں سائنسی طور پر درست ہیں تو اس کا امکان موجود ہے کیونکہ بائبل میں کلامِ الٰہی کے شامل ہونے کا امکان ہم تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اغلاط کے بارے میں کیا کیا جائے؟

کیا آپ یہ پسند کرتے ہیں کہ ان اغلاط کو خدا کی طرف منسوب کیا جائے؟

میں یہ بات اپنے مسیحی بہن بھائیوں کے سامنے بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری گفتگو کا مقصد کسی کی دلآزاری نہیں ہے۔ اگر بائبل اور سائنس پر گفتگو کرتے ہوئے میری کسی بات سے آپ کی دلآزاری ہو تو میں اس کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔

ہماری گفتگو کا مقصد تو صرف یہ بتانا ہے کہ کلامِ خداوندی میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ اس میں سائنسی غلطیوں کا امکان ہی نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی یہی فرماتے تھے کہ سچائی کو تلاش کرو۔

دیکھیے ہمارے پاس عہد نامہ قدیم ہے، عہد نامہ جدید ہے اور خدا کی آخری وحی بھی ہمارے پاس قرآن کی صورت میں موجود ہے۔

جہاں تک ڈاکٹر ولیم کیمپبل کا تعلق ہے، ان کے ساتھ میں خاصی بے تکلفی برت سکتا ہوں کیونکہ وہ ایک کتاب لکھ چکے ہیں جس کا عنوان ہے "قرآن اور بائبل تاریخ اور سائنس کی روشنی میں۔"

وہ ایک بیان دے چکے ہیں اور ویسے بھی وہ ایک ڈاکٹر ہیں لہٰذا ان کے معاملے میں مجھے تکلف برتنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے لیکن جہاں تک دوسرے مسیحی بہن بھائیوں کا تعلق ہے اگر دورانِ گفتگو ان کے جذبات مجروح ہوں تو ان سے میں معذرت خواہ ہوں۔

آیئے! اب ہم دیکھتے ہیں کہ بائبل، سائنس کے بارے میں کیا کہتی ہے؟

آغاز ہم فلکیات سے کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ بائبل ہمیں علم فلکیات کے بارے میں کیا بتاتی ہے۔ بائبل میں تخلیق کائنات کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ بائبل کے آغاز میں ہی تخلیق کائنات کا ذکر موجود ہے یعنی پہلی کتاب، پیدائش میں بتایا گیا ہے:

''خدا نے ابتدا میں زمین و آسمان کو پیدا کیا، اور زمین ویران اور سنسان تھی اور گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا اور خدا کی روح پانی کی سطح پر جنبش کرتی تھی اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے اور خدا نے روشنی کو تو دن کہا اور تاریکی کو رات اور شام ہوئی اور صبح ہوئی سو پہلا دن ہوا۔'' [پیدائش، باب ا......۵-ا]

بائبل ہمیں بتاتی ہے کہ خدا نے کائنات کو چھ دن میں پیدا کیا اور بائبل صبح اور شام کا بھی ذکر کرتی ہے یعنی چوبیس گھنٹے والے دن کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سائنس دان ہمیں بتاتے ہیں کہ چوبیس گھنٹے والے چھ دنوں میں کائنات کی تشکیل ممکن ہی نہیں ہے۔

قرآن بھی اس حوالے سے چھ ایام کا ذکر کرتا ہے۔ عربی لفظ ایام ہے جس کا واحد یوم ہوتا ہے۔ لفظ یوم کا مطلب چوبیس گھنٹے کا ایک دن بھی ہوتا ہے اور اس سے مراد طویل عرصہ بھی ہو سکتا ہے یعنی ''ایک زمانہ۔'' اور یہ بات تسلیم کرنے میں کسی سائنس دان کو کوئی اعتراض نہ ہوگا کہ دنیا چھ ''طویل وقفوں'' یا ''زمانوں'' میں تخلیق ہوئی ہو۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ بائبل اپنی بالکل ابتدائی آیات یعنی آیات ۳ تا ۵ میں یہ بتاتی ہے کہ روشنی پہلے دن تخلیق ہوئی جب کہ روشنی کے اسباب سورج اور ستارے وغیرہ چوتھے دن تخلیق ہو رہے ہیں۔ اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ روشنی کے اسباب و ذرائع چوتھے دن تخلیق ہوں جب کہ روشنی پہلے ہی دن تخلیق ہو چکی ہو۔ یہ ایک بالکل غیر سائنسی بات ہے۔ مزید برآں تیسرا نکتہ یہ ہے کہ آیات نمبر ۹ تا ۱۳ میں بتایا جا رہا ہے کہ زمین تخلیق ہوئی تو اگر زمین اس مرحلے میں تخلیق ہو رہی ہے تو صبح اور شام پہلے دن کس طرح تخلیق ہو گئے تھے۔ دن اور رات کا انحصار ہی زمین کی گردش پر ہے اور اگر زمین نہیں بنی تھی تو دن اور رات کا تصور ہی

ممکن نہیں تھا۔

چوتھا نکتہ یہ کہ کتاب پیدائش، پہلے باب کی آیات ۹ تا ۱۳ ہمیں بتاتی ہیں کہ زمین کی تشکیل تیسرے دن ہوئی تھی جب کہ آیات ۱۴ تا ۱۹ سے پتہ چلتا ہے کہ سورج اور چاند چوتھے دن بنائے گئے۔ لیکن جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ زمین دراصل سورج ہی کا ایک حصہ ہے، لہٰذا اس کا سورج سے پہلے تخلیق ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ غیر سائنسی بات ہے۔

پانچواں نکتہ یہ ہے کہ کتاب پیدائش پہلے باب کی آیات نمبر ۹ تا ۱۳ ہمیں بتاتی ہیں کہ زمین پر گھاس اور بوٹیاں اور درخت تیسرے دن تخلیق ہوئے جب کہ سورج کی تشکیل چوتھے دن ہوئی جیسا کہ آیات ۱۴ تا ۱۹ میں درج ہے۔ سائنس کا سوال یہ ہے کہ سورج کی روشنی کے بغیر نباتات کی نشوونما اور بقا کس طرح ممکن ہے؟

چھٹا نکتہ یہ کہ کتاب پیدائش باب ۱، آیت ۱۷ میں کہا گیا ہے کہ:

''سو خدا نے دو بڑے نیر بنائے۔ ایک نیر اکبر کہ دن پر حکم کرے اور ایک نیر اصغر کہ رات پر حکم کرے اور اس نے ستاروں کو بھی بنایا۔''

اس آیت اور آیات ماقبل و مابعد سے پتہ چلتا ہے کہ چاند اور سورج دونوں روشن اجسام ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ بات مسلمہ سائنسی حقائق کے خلاف جاتی ہے۔

کچھ لوگ مطابقت پیدا کرنے کے لیے یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ بائبل میں بیان کردہ چھ دن بھی درحقیقت چھ زمانے ہیں لیکن ان کی یہ بات بھی غیر منطقی ہے۔ کیوں کہ آپ صاف دیکھ سکتے ہیں کہ بائبل میں صبح کا بھی ذکر ہو رہا ہے اور شام کا بھی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں چوبیس گھنٹے والا دن ہی مراد ہے۔ لیکن بالفرض میں یہ غیر منطقی دلیل تسلیم کر بھی لوں تو اس طرح زیادہ سے زیادہ پہلے دو نکات کا جواب ملتا ہے جب کہ باقی ماندہ چار سوالات پھر بھی جواب طلب ہی رہ جاتے ہیں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر یہاں عام دن ہی مراد ہے تو پھر نباتات چوبیس گھنٹے روشنی کے بغیر بھی گزارسکتی ہیں۔ میں کہتا ہوں چلیے آپ کی یہ بات تسلیم کیے لیتے ہیں لیکن

اس طرح نباتات والا مسئلہ تو حل ہوتا ہے دیگر مسائل پھر جواب طلب رہ جاتے ہیں۔ آپ ''چت بھی میری، پٹ بھی میری'' والا رویہ نہیں اپنا سکتے۔

لہٰذا اب میں یہ بات ڈاکٹر ولیم کیمپبل پر چھوڑ دیتا ہوں۔ ان کے پاس دو صورتیں ہیں:

یا تو وہ یہ تسلیم کرلیں کہ دن سے مراد ایک طویل زمانہ ہے تو آپ پہلا اور تیسرا نکتہ حل کرلیں گے لیکن دوسرا، چوتھا، پانچواں اور چھٹا نکتہ حل طلب رہ جائے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ دن کو ۲۴ گھنٹے کا عام دن ہی فرض کریں، اس صورت میں وہ صرف پانچویں نکتے کا جواب مہیا کردیں گے لیکن باقی تمام نکات حل طلب رہ جائیں گے۔

اب جہاں تک زمین کا تعلق ہے اس بارے میں متعدد سائنسی نظریات موجود ہیں۔ یہ نظریات محض مفروضے ہیں جو درست بھی ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ لیکن یا تو زمین بالآخر فنا ہو جائے گی اور یا ہمیشہ موجود رہے گی۔ ان میں سے کوئی ایک نظریہ ہی درست ہوسکتا ہے دونوں باتیں بیک وقت درست نہیں ہوسکتیں۔ یہ ایک غیر سائنسی بات ہوگی۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بائبل یہی کہتی ہے یعنی دونوں باتوں کا ذکر کرتی ہے۔ عبرانیوں کے نام پولس رسول کے خط کے پہلے باب کی گیارھویں اور بارھویں آیت میں کہا گیا ہے:

''اے خداوند!

تو نے ابتدا میں زمین کی نیو ڈالی

اور آسمان تیرے ہاتھ کی کاریگری ہیں

وہ نیست ہو جائیں گے مگر تو باقی رہے گا

اور وہ سب پوشاک کی مانند پرانے ہو جائیں گے۔''

اسی طرح کتاب زبور کے باب نمبر ۱۰۲ میں کہا گیا:

''تو نے قدیم سے زمین کی بنیاد ڈالی

آسمان تیرے ہاتھ کی صنعت ہے

وہ نیست ہو جائیں گے پر تو باقی رہے گا۔''

لیکن دوسری طرف اس کے بالکل برعکس اور متضاد بیانات بھی بائبل میں موجود ہیں۔

''انسان کو اس ساری محنت سے جو وہ کرتا ہے کیا حاصل ہے؟

ایک پشت جاتی ہے اور دوسری پشت آتی ہے پر زمین ہمیشہ قایم رہتی ہے۔''

[واعظ، باب ا......۳،۴]

اسی طرح زبور میں کہا گیا:

''اور اپنے مقدس کو پہاڑوں کی مانند تعمیر کیا اور زمین کی مانند

جسے اس نے ہمیشہ کے لیے قایم کیا ہے۔'' [زبور، باب ۷۸۔۶۹]

اب میں یہ بات ڈاکٹر ولیم کیمپبل پر چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ خود انتخاب کرلیں کہ کون سی بات غلط ہے کیونکہ دونوں باتیں بیک وقت تو درست نہیں ہوسکتیں۔ دنیا بیک وقت فانی اور غیر فانی نہیں ہوسکتی ہے۔

اب ہم آسمان کی طرف آتے ہیں۔ بائبل میں کہا گیا ہے:

''اور آسمان کے ستون کانپتے ہیں

اور اس کی جھڑکی سے حیران ہوتے ہیں۔'' [ایوب، باب ۲۶۔۱۱]

جب کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِغَيْرِ عَمَدٍ﴾ [لقمٰن: ۱۰]

''اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے۔''

بائبل کہتی ہے کہ آسمان کے ستون ہیں، قرآن کہتا ہے کہ آسمان بغیر ستونوں کے ہے، کیا آپ خود نہیں دیکھ سکتے کہ آسمان کے ستون موجود ہیں یا نہیں؟

بائبل نہ صرف یہ کہتی ہے کہ آسمان کے ستون ہیں بلکہ وہ تو زمین کے بارے میں بھی یہی بات کرتی ہے:

''زمین کے ستون خداوند کے ہیں

اس نے دنیا کو ان ہی پر قایم کیا ہے۔'' [سیموئیل۔ا، باب ۲۔۸]

''زمین اور اس کے سب باشندے گداز ہو گئے ہیں

میں نے اس کے ستونوں کو قایم کر دیا ہے۔'' [زبور، باب ۷۵۔۳]

''وہ زمین کو اس کی جگہ سے ہلا دیتا ہے

اور اس کے ستون کانپنے لگتے ہیں۔'' [ایوب، باب ۹۔٦]

اب ہم آتے ہیں غذائیات کی طرف۔ کتاب پیدائش میں کہا گیا:

''اور خدا نے کہا دیکھو میں تمام روئی، زمین کی کل بیج دار سبزی اور ہر درخت

جس میں اس کا بیج دار پھل ہو، تم کو دیتا ہوں، یہ تمہارے کھانے کو ہوں۔''

[پیدائش، باب ا، ۲۹]

آج ایک عام آدمی بھی بخوبی جانتا ہے کہ کچھ بیج دار نباتات اس قدر زہریلی ہوتی ہیں کہ انھیں کھانے والا یقینی طور پر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ جب کہ بائبل کہتی ہے کہ ایسے تمام پھل کھانے کے لیے ہیں۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ڈاکٹر کیمپبل اپنے مریضوں کو یہ پھل نہیں دیتے ہوں گے۔

بائبل میں ایک ایسا طریقہ کار بتایا گیا ہے جس کی مدد سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کون حقیقی ایماندار ہے۔

''اور ایمان لانے والوں کے درمیان یہ معجزے ہوں گے۔

وہ میرے نام سے بدروحوں کو نکال لیں گے۔

نئی نئی زبانیں بولیں گے۔

سانپوں کو اُٹھا لیں گے۔

اور اگر کوئی ہلاک کرنے والی چیز پئیں گے تو انھیں کوئی ضرر نہ پہنچے گا، وہ بیماروں پر ہاتھ رکھیں گے تو اچھے ہو جائیں گے۔'' [مرقس، باب ١٦۔١٨۔١٧]

یہ ایک سائنسی ٹسٹ ہے۔ سائنس کی اصطلاح میں ہم اسے ایک Confirmatory

Test کہہ سکتے ہیں۔ جس کے ذریعے ایک حقیقی مسیحی کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

اپنی زندگی کے گزشتہ دس سالوں کے دوران میں، مجھے بلا مبالغہ ہزاروں عیسائیوں سے واسطہ پڑا ہے جن میں عیسائیت کے مبلغین بھی شامل تھے۔ لیکن میں نے آج تک کوئی ایک بھی ایسا عیسائی نہیں دیکھا جو انجیل کے اس امتحان میں کامیاب ہو سکے۔ میں نے کوئی ایک بھی عیسائی نہیں دیکھا جو زہر کھائے لیکن اس پر زہر کام نہ کرے۔ سائنسی اصطلاح میں ہم اس امتحان کو Falsification Test بھی کہہ سکتے ہیں یعنی اگر کوئی غلط آدمی یہ امتحان دے گا تو وہ ناکام ہو جائے گا۔ اگر غلط آدمی زہر کھائے گا تو مر جائے گا۔ کوئی غلط آدمی یہ امتحان دینے کی جرأت ہی نہیں کرے گا۔ اگر آپ ایک حقیقی عیسائی نہیں ہیں تو آپ کبھی یہ امتحان نہیں دیں گے۔

میں نے ڈاکٹر ولیم کیمپبل کی کتاب "The Quran & The Bible , In the Light of History & Science" پڑھی ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ ایک حقیقی مسیحی ہیں۔ اور میری خواہش ہے کہ کم از کم وہ یہ امتحان ضرور دیں۔ میں ان سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ کوئی خطرناک زہر کھا کر دکھائیں کیونکہ اس طرح تو ہمارا یہ مباحثہ ہی خراب ہو جائے گا۔ میں ان سے صرف یہ درخواست کروں گا کہ وہ ہمیں نئی زبانیں بول کر دکھائیں۔ آپ میں سے بہت سے لوگ یہ جانتے ہوں گے کہ ہندوستان میں ایک ہزار سے زیادہ مختلف زبانیں اور لہجے موجود ہیں۔ ان میں سے ۱۷ زبانیں ایسی ہیں جنھیں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ صرف تین الفاظ ان ۱۷ زبانوں میں بول کر دکھائیں یعنی "ایک سو روپے"

ڈاکٹر صاحب کی مدد کے لیے میں انھیں سو روپے کا نوٹ بھی پیش کر دیتا ہوں۔ اس نوٹ پر یہ سترہ زبانیں موجود ہیں۔ انگریزی اور ہندی سمیت۔ انگریزی میں One Hundered Rupees تو وہ پڑھ ہی لیں گے۔ ہندی میں انہیں بتا دیتا ہوں "ایک سو روپے"

اب باقی پندرہ زبانوں میں یہ تین الفاظ وہ بول دیں۔ میں جانتا ہوں کہ انجیل کے بیان کے مطابق انہیں یہ زبانیں بغیر کسی کی مدد کے بولنی چاہئیں لیکن میں ان کی مدد کر رہا ہوں کیوں کہ میں چاہتا ہوں کہ کوئی تو یہ ٹسٹ پاس کرے۔ میں نے تو آج تک کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو یہ امتحان پاس کر سکے۔

لہٰذا میں یہ نوٹ انھیں پیش کرتا ہوں۔ وہ یہ تین الفاظ پندرہ زبانوں میں پڑھ دیں۔

''ایک سو روپے۔''

اب ہم آبیات یا ''علم الآب'' Hydrology کا ذکر کرتے ہیں۔ بائبل میں کہا گیا ہے:

''میں اپنی کمان کو بادل میں رکھتا ہوں
وہ میرے اور زمین کے درمیان عہد کا نشان ہوگی
اور ایسا ہوگا کہ جب میں زمین پر بادل لاؤں گا
تو میری کمان بادل میں دکھائی دے گی
اور میں اپنے عہد کو جو میرے اور تمہارے
اور ہر طرح کے جاندار کے درمیان ہے، یاد کروں گا
اور تمام جان داروں کی ہلاکت کے لیے پانی کا طوفان پھر نہ ہوگا
اور کمان بادل میں ہوگی اور میں اس پر نگاہ کروں گا
تاکہ اس ابدی عہد کو یاد کروں جو خدا کے
اور زمین کے سب طرح کے جاندار کے درمیان ہے
پس خدا نے نوح سے کہا
کہ یہ اس عہد کا نشان ہے
جو میں اپنے اور زمین کے کل جانداروں کے درمیان قایم کرتا ہوں۔''

[پیدائش، باب ۹۔ ۱۷-۱۴]

مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفانِ نوح کے اترنے کے بعد یہ عہد خدا اور حضرت نوح علیہ السلام کے مابین ہوا اور اس کی نشانی کے طور پر فلک میں قوس قزح نظر آئی۔ یعنی اس سے پہلے قوس قزح نہیں ہوا کرتی تھی۔ لیکن یہ ایک غیر سائنسی بیان ہے۔ یہ بات کیوں کر تسلیم کی جاسکتی ہے کہ طوفانِ نوح علیہ السلام سے قبل بادل تو ہوتے تھے۔ بارش تو برستی تھی لیکن قوس قزح نہیں بنتی تھی۔ کیا اس وقت Law of Refraction موجود نہیں تھا؟ یقیناً حضرت نوح علیہ السلام کے دور سے پہلے بھی بے شمار مرتبہ قوس قزح بنتی رہی ہوگی۔

اب ہم آتے ہیں علم طب کی جانب۔ انجیل میں گھر کو کوڑھ کی وبا سے محفوظ کرنے کے لیے ایک طریقہ بتایا گیا ہے، جو کچھ یوں ہے:

"اور وہ اس گھر کو پاک قرار دینے کے لیے
دو پرندے اور دیودار کی لکڑی اور سرخ کپڑا اور زوفا لے
اور وہ ان پرندوں میں سے ایک کو مٹی کے کسی برتن میں
بہتے ہوئے پانی پر ذبح کرے
پھر وہ دیودار کی لکڑی اور زوفا اور سرخ کپڑے
اور اس زندہ پرندے کو لے کر
ان کو اس ذبح کیے ہوئے پرندے کے خون
میں اور بہتے ہوئے پانی میں غوطہ دے
اور سات بار اس گھر پر چھڑکے
اور اس پرندے کے خون سے
اور بہتے ہوئے پانی
اور زندہ پرندے، دیودار کی لکڑی اور زوفا اور
سرخ کپڑے سے اس گھر کو صاف کرے
اور اس زندہ پرندے کو شہر کے باہر

کھلے میدان میں چھوڑ دے

یوں وہ گھر کے لیے کفارہ دے تو گھر پاک ٹھہرے گا۔" [احبار، باب ۱۴۔۵۳،۴۹]

یعنی گھر کو کوڑھ کے جراثیم سے پاک کرنے کے لیے اس میں خون چھڑکا جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ خون جراثیم کو پھیلانے کا بہترین ذریعہ ہے نہ کہ جراثیم کو ختم کرنے کا۔ مجھے اُمید ہے کہ ڈاکٹر کیمپبل اس طریقہ سے اپنے آپریشن تھیٹر کی صفائی نہیں کرتے ہوں گے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ نفاس کا خون، وہ خون جو بچے کی پیدائش کے دوران یا اس کے بعد آتا ہے ناپاک ہوتا ہے لیکن بائبل اس بارے میں کہتی ہے:

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا

بنی اسرائیل سے کہہ کہ

اگر کوئی عورت حاملہ ہو اور اس کا لڑکا ہو

تو وہ سات دن ناپاک رہے گی

جیسے حیض کے ایام میں رہتی ہے

اور آٹھویں دن لڑکے کا ختنہ کیا جائے

اس کے بعد تینتیس دن تک وہ طہارت کے خون میں رہے اور جب تک اس کی طہارت کے ایام پورے نہ ہوں تب تک نہ تو کسی مقدس چیز کو چھوئے

اور نہ مقدس مقام میں داخل ہو۔

اور اگر اس کے لڑکی ہو

تو وہ دو ہفتے ناپاک رہے گی

جیسے حیض کے ایام میں رہتی ہے

اس کے بعد چھیاسٹھ دن تک وہ طہارت کے خون میں رہے۔"

[احبار۔ باب ۱۲۔ ۶،۱]

یعنی اگر وہ بیٹے کو جنم دیتی ہے تو چالیس دن ناپاک رہے گی لیکن اگر وہ بیٹی کو جنم دیتی ہے تو پورے اسّی دن تک ناپاک رہے گی۔ میں ڈاکٹر کیمپبل سے درخواست کروں گا کہ وہ وضاحت فرمائیں کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ سائنسی طور پر عورت بیٹی پیدا ہونے کی صورت میں دگنے عرصے تک کیوں ناپاک رہتی ہے۔

انجیل میں کسی عورت کی بدکرداری ثابت کرنے کے لیے بھی ایک امتحان بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل گنتی کے باب نمبر ۵ کی آیات ۱۱ تا ۳۱ میں موجود ہے۔ میں اس کا خلاصہ بیان کرتا ہوں۔

"اگر کسی کی بیوی گمراہ ہو کر اس سے بے وفائی کرے ..... پر نہ تو کوئی شاہد ہو اور نہ وہ عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہو..... تو وہ شخص اپنی بیوی کو کاہن کے پاس لائے ..... اور کاہن مٹی کے ایک برتن میں مقدس پانی لے ..... اور مسکن کے فرش کی گرد لے کر اس پانی میں ڈالے ..... اور وہ کڑوا پانی اس عورت کو پلائے ..... جب وہ اس کو پانی پلا چکے گا تو ایسا ہوگا کہ اگر وہ ناپاک ہوئی .....تو وہ پانی جو لعنت کو لاتا ہے اس کے پیٹ میں جا کر کڑوا ہو جائے گا، اس کا پیٹ پھول جائے گا، اس کی ران سڑ جائے گی ..... پر اگر وہ ناپاک نہیں ہوئی بلکہ پاک ہے تو بے الزام ٹھہرے گی اور اس سے اولاد ہوگی۔"

[گنتی۔ باب نمبر ۵۔ ۱۱، ۳۱]

آپ جانتے ہیں آج کل عدالتوں میں اس قسم کے بے شمار کیس پوری دنیا میں فیصلے کے منتظر ہیں۔ جن میں عورت پر اس شک کا اظہار کیا گیا ہے کہ وہ بدکردار ہے۔ بلکہ مجھے اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ اس عظیم ملک امریکہ کے صدر جناب بل کلنٹن پر بھی چند سال پہلے اس قسم کے الزامات لگائے گئے تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ امریکی عدالتیں ایسے مواقع پر انجیل میں بتایا گیا یہ امتحان کیوں نہیں لیتیں؟

ریاضی بھی سائنس کا ایک شعبہ ہے اور انتہائی اہم شعبہ ہے۔ اس حوالے سے دیکھا

جائے تو بائبل میں ہمیں سینکڑوں تضادات نظر آتے ہیں۔ میں ان میں سے صرف چند ہی کا ذکر کروں گا۔

جب بنی اسرائیل کو بابل سے رہائی ملی تو وہ واپس آئے۔ ان کی فہرست بائبل میں موجود ہے۔ عزرا کے دوسرے باب کی آیات نمبر ۲ تا ۶۳ اور نحمیاہ باب نمبر ۷ آیات ۷ تا ۶۵۔ ان آیات میں مکمل فہرست دی گئی ہے۔ لیکن ان دونوں فہرستوں میں کم از کم ۱۸ جگہ تضادات موجود ہیں۔

مزید برآں کتاب عزرا میں کل تعداد بیالیس ہزار تین سو ساٹھ بتائی گئی ہے جب کہ نحمیاہ میں بھی کل تعداد یہی بتائی گئی ہے یعنی بیالیس ہزار تین سو ساٹھ لیکن جب میں نے خود اس تعداد کو جمع کیا تو جواب بالکل مختلف تھا۔

یعنی عزرا میں بیان کی گئی تعداد انتیس ہزار آٹھ سو اٹھارہ بنتی ہے۔ اسی طرح نحمیاہ میں بیان کی گئی تعداد کو جمع کیا جائے تو وہاں بھی میزان اکتیس ہزار اٹھانوے (۳۱،۰۸۹) آئے گا۔

اگر بائبل کا مصنف سیدھا سادا میزان بھی نہیں کر سکتا تھا تو کیا اس کتاب کو خدا کی جانب سے نازل کردہ تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ نعوذ باللہ

آگے چلیے۔ عزرا میں کہا گیا ہے کہ:

"ان کے ساتھ دو سو گانے والے اور گانے والیاں تھیں۔"

جب کہ نحمیاہ میں کہا جا رہا ہے:

"اور ان کے ساتھ دو سو پینتالیس گانے والے اور گانے والیاں تھیں۔"

اب آپ ہی بتائیے کہ یہ تعداد دو سو تھی یا دو سو پینتالیس؟ کیوں کہ بات ایک ہی سیاق و سباق میں ہو رہی ہے لیکن ریاضیاتی تضاد موجود ہے۔ اسی طرح سلاطین ۲ کے باب نمبر ۲۴ میں تحریر ہے:

"اور یہویاکین جب سلطنت کرنے لگا تو اٹھارہ برس کا تھا اور یروشلم میں اس

نے تین مہینے سلطنت کی۔'' [آیت نمبر ۸]

لیکن تواریخ۔۲ کے باب نمبر ۳۶ میں کہا جارہا ہے:

''یہویاکین آٹھ برس کا تھا جب وہ سلطنت کرنے لگا اور اس نے تین مہینے دس دن حکومت کی۔'' [آیت نمبر ۹]

تضاد بالکل واضح ہے۔ میں ڈاکٹر کیمپبل سے پوچھنا چاہوں گا کہ جب یہویاکین نے سلطنت شروع کی تو اس کی عمر آٹھ برس تھی یا اٹھارہ برس؟ اور یہ بھی کہ اس نے حکومت ۳ مہینے کی یا تین مہینے اور دس دن؟

مزید برآں بائبل میں ہیکل سلیمانی کا ذکر کرتے ہوئے سلاطین۔۱ کے باب ۷ کی آیت نمبر ۲۶ میں تحریر ہے:

''اور دل اس کا چار انگل تھا اور اس کا کنارہ پیالہ کے کنارہ کی طرح گلِ سوسن کے مانند تھا اور اس میں دو ہزار بت کی سمائی تھی۔''

دوسری جگہ یعنی تواریخ۔۲، باب۴، آیت ۵ میں ہیکل سلیمانی ہی کے ذکر میں یہ بات اس طرح مذکور ہے:

''اور اس کی موٹائی چار انگل کی تھی اور اس کا کنارہ پیالہ کے کنارہ کی طرح اور سوسن کے پھول سے مشابہ تھا۔ اس میں تین ہزار بت کی سمائی تھی۔''

اب میں ڈاکٹر کیمپبل پر چھوڑتا ہوں۔ وہ ہمیں بتائیں کہ وہاں تین ہزار بت کی سمائی تھی یا دو ہزار بت کی؟

یہاں ایک واضح ریاضیاتی تضاد ہمارے سامنے موجود ہے۔

آگے چلیے، سلاطین۔۱ کے باب نمبر ۱۵ کی آیات ۳۳، ۳۴ پڑھیے۔ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہِ یہوداہ آسا کے چھبیسویں سال بعشا مرگیا تھا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا ایلہ حکومت کرنے لگا۔

لیکن تواریخ۔۲ کا سولھواں باب پڑھنا شروع کیجیے۔ یہاں کہا گیا ہے کہ آسا کے

چھتیسویں برس بعشا نے یہوداہ پر حملہ کیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعشا اپنی موت کے دس سال بعد کس طرح یہوداہ پر چڑھائی کرسکتا ہے؟ یہ ایک بالکل غیر سائنسی بات ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل کی آسانی کے لیے میں اپنی گفتگو کا خلاصہ بیان کر دیتا ہوں تاکہ وہ اس کا جواب دے سکیں۔

پہلا نکتہ یہ کہ بائبل کے بیان کے مطابق کائنات چھ دنوں میں یعنی چوبیس گھنٹے والے دنوں میں تخلیق ہوئی جوکہ ظاہر ہے کہ غیر سائنسی بات ہے۔

دوسرا یہ کہ بائبل کے بیان کے مطابق روشنی کی تخلیق سورج اور ستاروں سے پہلے ہوئی تھی، یہ بات بھی غیر منطقی ہے۔

تیسرا نکتہ یہ تھا کہ دن اور رات کی تشکیل زمین کے تخلیق ہونے سے قبل ممکن نہیں لیکن بائبل ایسا ہی ظاہر کرتی ہے۔

چوتھا نکتہ میں نے یہ بیان کیا تھا کہ بائبل کے مطابق نباتات کی تخلیق سورج سے قبل ہو گئی تھی۔ یہ غیر سائنسی بیان ہے کیوں کہ پودوں کو اپنی نشو ونما کے لیے سورج کی روشنی درکار ہوتی ہے۔

پانچویں بات میں نے یہ کی کہ زمین کی تخلیق سورج سے قبل بتائی گئی ہے اور یہ بات سائنس کی روشنی میں بالکل درست نہیں۔

چھٹا نکتہ یہ تھا کہ بائبل کے بیان کے مطابق چاند کی روشنی اس کی اپنی روشنی ہے۔

ساتواں نکتہ یہ تھا کہ زمین ہمیشہ قایم رہے گی یا فنا ہو جائے گی؟

آٹھواں نکتہ یہ کہ بائبل میں زمین کے ستون بیان کیے گئے ہیں۔

نوواں یہ کہ آسمان کے بھی ستون بتائے گئے ہیں۔

دسواں یہ کہ بائبل کے بیان کے مطابق تمام بیج دار پھل انسان کے کھانے کے لیے بنائے گئے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان میں کئی انتہائی زہریلے بھی ہوتے ہیں۔

گیارھویں بات میں نے یہ کی تھی کہ بائبل میں ایک امتحان بتایا گیا ہے جس سے ایک سچے مسیحی کا ایمان معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کیا کوئی مسیحی یہ امتحان دینے کے لیے تیار ہے؟

بارھواں نکتہ یہ تھا کہ بیٹی کی پیدائش کی صورت میں ماں دگنے عرصے تک کیوں ناپاک رہتی ہے؟

تیرھواں نکتہ یہ تھا کہ بائبل میں مکان کو کوڑھ کی وبا سے محفوظ رکھنے کے لیے خون چھڑکنے کا مشورہ دیا گیا ہے جو کہ قطعاً غیر سائنسی ہے۔

چودھواں نکتہ یہ کہ بدکرداری معلوم کرنے کے لیے جو کڑوے پانی کا امتحان بیان کیا گیا ہے اس کی وضاحت کی جائے۔

پندرھواں نکتہ یہ کہ بائبل میں ایک ہی جگہ ساٹھ سے بھی کم آیات میں اٹھارہ تضادات موجود ہیں۔ اور میں اسے ایک ہی نکتہ یا ایک ہی سوال گن رہا ہوں، حالانکہ یہ اٹھارہ نکات ہیں۔

سولھواں نکتہ یہ کہ مندرجہ بالا معاملے میں دونوں جگہ تعداد مختلف ہے یعنی ایک تو بیان کردہ کل تعداد غلط ہے اور دوسرے دونوں ابواب میں میزان مختلف نکلتا ہے۔

سوال نمبر سترہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا موقع پر یعنی بابل سے بنی اسرائیل کی رہائی کے موقع پر گانے والوں اور گانے والیوں کی تعداد دو سو تھی یا دو سو پینتالیس؟

اٹھارواں سوال یہ کہ جب یہویاکین نے سلطنت شروع کی تو اس کی عمر اٹھارہ سال تھی یا آٹھ سال؟

انیسواں سوال یہ ہے کہ اس نے حکومت تین ماہ کی تھی یا تین ماہ اور دس دن؟

بیسواں نکتہ یہ کہ ہیکل سلیمانی میں ''دو ہزار بت کی سمائی تھی'' یا ''تین ہزار بت'' کی؟

اکیسواں سوال یہ کہ بعشا اپنی موت کے دس سال بعد کیوں کر یہوداہ پر چڑھائی کر سکتا تھا؟

بائیسواں نکتہ یہ تھا کہ قوس قزح کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ طوفان نوح کے بعد خدا کے وعدے کی نشانی کے طور پر ظاہر ہوئی۔

میں نے بائبل میں موجود سینکڑوں سائنسی اغلاط میں سے صرف بائیس کی نشان دہی کی ہے۔ میں ڈاکٹر ولیم کیمپبل سے درخواست کروں گا کہ وہ ان کا جواب دیں۔ وہ منطقی اور سائنسی طور پر ان ۲۲ نکات کا جواب کبھی نہیں دے سکیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہمارا بھی ایمان ہے۔ انھیں انجیل عطا کی گئی تھی۔ لیکن یہ وہ انجیل نہیں ہے۔ شاید اس میں جزوی طور پر وحی خداوندی موجود ہو لیکن مجموعی طور پر وہ انجیل ہرگز نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اس کا غیر سائنسی اور غیر منطقی حصہ ہرگز منزل من اللہ نہیں ہے۔

میں اپنی گفتگو کا اختتام اس آیت قرآنی پر کرنا چاہوں گا:

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾ [البقرہ: ۷۹]

''پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے۔ تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فایدہ حاصل کرلیں۔ ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجب ہلاکت۔''

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

☆..........☆..........☆

جوابی خطاب

ڈاکٹر ولیم کیمپبل

دیکھیے، ڈاکٹر ذاکر نائیک کچھ حقیقی نوعیت کے مسائل سامنے لائے ہیں۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے میں ان کے جواب سے اتفاق نہیں کرتا۔ یعنی جہاں تک "علقة" اور "مضغة" کے الفاظ کا تعلق ہے، میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان کا ایک نقطۂ نظر ہے اور میرا بھی ایک نقطہ نظر ہے۔ دونوں نقطہ ہائے نظر سننے کے بعد ہر کسی کو گھر جا کر خود اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے۔

جہاں تک زہر والے امتحان کا تعلق ہے، میں کسی ایسے شخص کو تو آپ کے سامنے پیش نہیں کر سکتا جو یہ امتحان دے چکا ہو، کیوں کہ وہ شخص فوت ہو چکا ہے لیکن میں اس کا واقعہ آپ کے سامنے بیان کر سکتا ہوں۔

میرے ایک دوست جن کا نام ہیری رینکلف تھا، وہ مراکش کے جنوبی علاقے کے ایک قصبے میں رہائش پذیر تھے۔ اسی قصبے کے ایک شخص نے جسے وہ اپنا دوست سمجھتے تھے، ان کی دعوت کی۔ اس نے ان کی بیوی اور بیٹے کو بھی اس دعوت میں مدعو کیا۔ ہیری نے یہ دعوت قبول کر لی۔ لیکن بعد میں کسی شخص نے آ کر انھیں بتایا کہ وہ شخص انھیں زہر دینا چاہتا ہے۔ اس کے باوجود وہ اس دعوت میں گئے۔ ہیری نے مذکورہ آیت کی روشنی میں فیصلہ کیا کہ اسے وہاں جانا چاہیے۔ لہٰذا وہ دعوت میں گئے۔ انھوں نے کوشش کی کہ اگر موقع ملے تو وہ پلیٹیں تبدیل کر دیں۔ لیکن انھیں یہ موقع نہ مل سکا۔ البتہ اپنے بیٹے کو وہ اچھی طرح کھانا کھلا کر لے گئے تھے۔ ان کی بیوی نے بھی زیادہ کھانا نہیں کھایا۔ لیکن ہیری کو کھانا ہی پڑا۔

اس رات ہیری کے معدے میں تکلیف ہوئی اور کچھ دیگر مسائل بھی ہوئے لیکن وہ

زندہ رہا۔ دو دن بعد ہیری اُس شخص کے گھر گیا، دروازے پر دستک دی۔ جب وہ باہر آیا تو ہیری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ لیکن ہیری دعوت کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گیا۔

چوں کہ یہ واقعہ مجھے یاد آ گیا تھا، لہٰذا میں نے سوچا آپ کو سنا ہی دیا جائے۔

اچھا، ایک بات آپ نے یہ کی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صرف یہودیوں کی طرف بھیجا گیا تھا اور دیگر اقوام کی طرف نہیں۔

لیکن خود قرآن میں کہا گیا ہے:

﴿وَ لِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ رَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا۝﴾

[مریم : ۲۱]

''اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور اپنی طرف سے رحمت۔'' [مریم:۲۱]

اسی طرح انجیل میں کہا گیا ہے:

''یسوع نے پاس آ کر ان سے باتیں کیں اور کہا آسمان اور زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے۔ پس تم جا کر سب قوموں کو شاگرد بناؤ اور ان کو باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو۔'' [متی باب ۲۸۔ ۱۹، ۱۸]

لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کو صرف یہودیوں کی طرف جانے کے لیے بھی کہا تھا اور اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیوں کہ یہودیوں کو ایک یقینی موقع دیا جانا تھا۔

انجیل میں ایک کہانی بیان کی گئی ہے...... بلکہ شاید مجھے ''کہانی'' کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے، یہ تو تاریخ ہے...... ہاں تو حکایت کچھ یوں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک انجیر کے درخت کے پاس آئے۔ اس درخت پر تین سال سے پھل نہیں آیا تھا۔ جب پوچھا گیا کہ کیا اس درخت کو اُکھاڑ پھینکا جائے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ ''نہیں'' ایک سال مزید انتظار کرو اور دیکھو، شاید یہ درخت پھل لے آئے۔

یہ ایک تمثیل تھی ، بنی اسرائیل کے بارے میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تین سال تک انھیں تبلیغ کی تھی اور چھ ماہ تک مزید تبلیغ کرنی تھی۔ اسی طرح مزید تمثیلات بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمت ان سے لے کر غیر اقوام کے حوالے کر دی جائے گی۔

ڈاکٹر نائیک نے ''دن'' کے ضمن میں ''زمانوں'' کے بارے میں بھی بات کی ہے۔ بائبل میں ''دن'' کے لفظ سے مراد ایک طویل زمانہ بھی ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس سے چوبیس گھنٹے والا دن ہی مراد ہو جیسا کہ ڈاکٹر موریس بوکا ئیے نے اپنی کتاب میں ثابت کرنا چاہا ہے۔ میرا خیال یہی ہے کہ اس سے طویل زمانے مراد ہیں۔ دیگر مسائل بھی ہیں جن کا ذکر ڈاکٹر نائیک نے کیا ہے، میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ مسائل موجود ہیں اور ان کے مناسب جوابات میرے پاس نہیں ہیں۔

لیکن میں یہاں اس حوالے سے بات ضرور کرنا چاہوں گا کہ ڈاکٹر صاحب نے دو طرح کے پانی کا ذکر کیا، نمکین یا کھاری پانی اور میٹھا پانی۔ میں اس سلسلے میں ان کی وضاحت سے بالکل مطمئن نہیں ہوں۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ دو طرح کے پانی ہیں جو اکٹھے ہوتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک روک ہوتی ہے جو انھیں ملنے نہیں دیتی۔ یہاں روک یا رکاوٹ کے لیے قرآن نے جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ ہے برزخ، برزخ کے معانی وقفہ، رکاوٹ، فاصلہ وغیرہ ہوتے ہیں۔

یہی بات سورۂ فرقان میں بھی کہی گئی ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَحِجْرًا مَّحْجُورًا﴾ [الفرقان : ۵۳]

''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے، ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور، اور دونوں کے درمیان ، ایک پردہ حائل ہے ، ایک رکاوٹ ہے جو دونوں کو گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

یہاں عربی کے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن کا مادہ ایک ہی ہے اور ایسا عربی

زبان میں اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی بات پر زور دیا جانا مقصود ہو۔ تاکید مطلوب ہو لہٰذا یہاں ترجمہ یہی ہونا چاہیے کہ کوئی باقاعدہ روک ہے جو کہ دونوں طرح کے پانیوں کے مابین موجود ہے۔

لیکن میرے دوست نے کہا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دونوں طرح کے پانی الگ الگ رہتے ہیں۔ یعنی نمکین پانی اور تازہ پانی ایک دوسرے سے علیحدہ رہتے ہیں۔ ڈاکٹر بوکائیے نے بھی اس حوالے سے کافی بحث کی ہے اور تسلیم کیا ہے کہ سمندر میں آگے جا کر بالآخر پانی آپس میں مل جاتے ہیں۔ بات صرف یہ ہے کہ اتنی زیادہ مقدار میں پانی کو حل ہونے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔

ایک چھوٹی سی مثال میں ذاتی طور پر بھی پیش کر سکتا ہوں۔ تیونس میں میرا ایک دوست ہے جو آکٹوپس پکڑتا ہے۔ ایک دفعہ میں اس سے ملنے گیا۔ میں پانی میں تیر رہا تھا۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ پانی اوپر سے ٹھنڈا اور نیچے سے گرم ہے۔ میں حیران ہوا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے۔

غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ قریب ہی ایک ندی آکر سمندر میں گر رہی تھی۔ ٹھنڈا پانی ندی کا تھا اور گرم پانی سمندر کا۔ سمندری پانی چوں کہ نمکین ہونے کی وجہ سے بھاری ہوتا ہے، لہٰذا وہ نیچے تھا اور تازہ پانی ہلکا ہونے کی وجہ سے اوپر تھا۔ یہی معاملہ ہوتا ہے۔ رکاوٹ کوئی نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب نے زبانوں کی بات کی اور ظاہر ہے میں ہندوستانی زبانیں نہیں بول سکتا بلکہ میں امریکی ہندیوں (Red Indians) کی زبانیں بھی نہیں بول سکتا لہٰذا امریکہ اور ہندوستان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن بات یہ ہے کہ انجیل کے جس مقام کے بارے میں وہ بات کر رہے ہیں وہاں بات حواریوں کے بارے میں ہو رہی ہے جنہیں یہ صلاحیت ایک معجزے کے طور پر دی گئی تھی۔ لیکن یہ وہ زبانیں تھیں جو وہاں کے موجود لوگ بولا کرتے تھے۔ اس سے مراد دنیا بھر کی چھوٹی چھوٹی اور گمنام زبانیں نہیں۔ ہوتا یہ تھا کہ اگر کوئی شخص

سپین سے آیا ہے تو حواری اس کے ساتھ سپین کی زبان میں گفتگو کرتا تھا، اگر کوئی دوسرا شخص ترکی سے آیا ہے تو اس کے ساتھ اس کی زبان میں گفتگو کی جاتی تھی۔

.... اب ہم بات کریں گے پیش گوئیوں کے بارے میں۔ ایک سچے نبی کو پہچاننے کا طریقہ یہ بھی ہے کہ کیا اس کی پیش گوئیاں سچ ثابت ہوئیں؟ آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی یہ سوال کر سکتے ہیں کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیش گوئیاں پوری ہوئیں؟ کیا، ان سے معجزات کا صدور ہوا؟

ہم پیش گوئیوں کا ریاضیاتی تجزیہ کریں گے۔ اس نظریے کو Theory of Probabilities بھی کہتے ہیں۔ میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

فرض کیجیے ڈاکٹر ذاکر نائیک کے پاس دس قمیصیں ہیں اور ان میں سے ایک کا رنگ سرخ ہے۔ اب میں پیش گوئی کرتا ہوں کہ ''کل ڈاکٹر ذاکر نائیک سرخ قمیص پہنیں گے۔'' اور فرض کیجیے اگلے دن واقعی ڈاکٹر نائیک سرخ قمیص پہنتے ہیں۔ اگر میں اپنی اس پیش گوئی کی بنیاد پر نبوت کا دعویٰ کروں تو کیا ہوگا؟ میرا ہر دوست کہے گا کہ نہیں نہیں، یہ تو محض اتفاق ہے۔

لیکن فرض کیجیے میں ایسی ہی پیش گوئی ڈاکٹر سمویل نعمان کے بارے میں بھی کر دیتا ہوں کہ وہ اپنی تین جوتیوں میں سے کل کون سی جوتی پہنیں گے، اسی طرح ڈاکٹر سہیل احمد کے بارے میں بھی پیش گوئی کر دیتا ہوں کہ وہ اپنی پانچ ٹوپیوں میں سے کل کون سی ٹوپی پہنیں گے تو میری ان تین پیش گوئیوں کے بیک وقت درست ثابت ہونے کے امکانات کس قدر ہیں؟

یہ امکان ڈیڑھ سو میں ایک ہے۔ ہم یہاں دس پیش گوئیوں کا ذکر کریں گے۔ ہمارے پاس وقت محدود ہے، اس لیے صرف دس پیش گوئیوں کا ذکر کیا جائے گا۔

پہلی پیش گوئی یرمیاہ کی ہے۔ ۶۰۰ قبل مسیح میں پیش گوئی کر دی گئی کہ مسیح کا تعلق داؤد کی نسل سے ہوگا۔ یرمیاہ میں بتا دیا گیا کہ داؤد کی نسل سے ایک بادشاہ کے آنے کا وقت

آرہا ہے جو یہوواہ کہلائے گا۔ یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم پیدا ہوئے۔ بنی اسرائیل میں اولادِ داؤد کا تناسب میرے خیال میں دوسو میں ایک تھا۔ یعنی اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا امکان دوسو میں ایک ہی تھا۔

دوسری پیش گوئی کہ دائمی حکومت کرنے والا بیت اللحم میں پیدا ہوگا۔ یہ بات میکاہ میں کی گئی یعنی ۷۵۰ ق م میں۔ اب یہ دیکھیے کہ بیت اللحم میں پیدا ہونے کے امکانات کیا ہیں، اگر حساب لگایا جائے تو.......... تقریباً ۲۸۰ میں سے ایک امکان یہ ہے۔

تیسری پیش گوئی ملاکی کے تیسرے باب میں کی گئی ہے:

''دیکھو میں رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے راہ درست کرے گا اور خداوند جس کے تم طالب ہو، ناگہاں اپنی ہیکل میں آموجود ہوگا، ہاں عہد کا رسول جس کے تم آرزومند ہو۔''

یہ بات ۴۰۰ ق م کی ہے۔ یحییٰ ابن زکریا نے بھی یہی پیش گوئی کی۔ قرآن بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں کہا گیا ہے:

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِيْ عَاقِرٌ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ○ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ○ وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ○ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِيْ وَ ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ○ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ○ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ

يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ○﴾ [آل عمران: ۳۹ تا ۴۵]

''فرشتوں نے آواز دی جب کہ وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا، کہ ''اللہ تجھے یحییٰ علیہ السلام کی خوش خبری دیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا۔ اس میں سرداری و بزرگی کی شان ہوگی۔ کمال درجے کا ضابط ہوگا۔ نبوت سے سرفراز ہوگا اور صالحین میں شمار کیا جائے گا۔'' زکریا علیہ السلام نے کہا ''پروردگار! بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا؟ میں تو بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔'' جواب ملا: ''ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔'' عرض کیا ''مالک، پھر کوئی نشانی میرے لیے مقرر فرما دے۔'' کہا ''نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارہ کے سوا کوئی بات چیت نہ کرو گے (یا نہ کر سکو گے)۔ اس دوران میں اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح شام اس کی تسبیح کرتے رہنا۔''

پھر وہ وقت آیا جب مریم علیہا السلام سے فرشتوں نے آ کر کہا ''اے مریمؑ! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ اے مریمؑ! اپنے رب کی تابع فرمان بن کر رہ۔ اس کے آگے سربسجود ہو، اور جو بندے اس کے حضور جھکنے والے ہیں ان کے ساتھ تو بھی جھک جا۔''

اے نبیؐ! یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سے بتا رہے ہیں، ورنہ تم اس وقت وہاں موجود نہ تھے جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مریمؑ کا سرپرست کون ہو؟ اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے، اور نہ تم اس وقت حاضر تھے جب ان کے درمیان جھگڑا برپا تھا۔

اور جب فرشتوں نے کہا: ''اے مریمؑ! اللہ تجھے اپنے ایک فرمان کی خوش خبری

دیتا ہے۔اس کا نام مسیح عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم ہوگا۔ دنیا اور آخرت میں معزز ہو گا۔ اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا، لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی، اور وہ ایک مردِ صالح ہوگا۔''

چوتھی پیش گوئی یہ کہ مسیح علیہ السلام سے معجزات کا صدور ہوگا۔ ہم انجیل میں پڑھتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کی پیش گوئی میں کہا گیا ہے کہ مسیح علیہ السلام سے بہت سے معجزات صادر ہوں گے۔ وہ اندھوں، بہروں اور گونگے لوگوں کو ٹھیک کردے گا۔

ہم انجیل اور قرآن دونوں میں دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کس قدر معجزات کا صدور ہوا۔ بعض اوقات ان کے پاس آنے والے سبھی لوگ شفایاب ہو جاتے تھے۔

بہت سے مسلمانوں کا خیال ہے کہ انبیائے کرام کی کل تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان ۱۲۴۰۰۰ انبیاءؑ میں سے واحد پیغمبر تھے، جن پر یہ پیش گوئی صادق آتی ہے۔

پانچویں پیش گوئی یہ کہ ان کے بھائی ان کی مخالفت کریں گے۔ اس پیش گوئی کے پورا ہونے کے امکانات کتنے تھے؟ چوں کہ بہت سے رہنماؤں کے رشتہ داران کی مخالفت کرتے ہیں، لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ پانچ میں سے ایک امکان تھا۔

چھٹی پیش گوئی جو کہ حضرت زکریا علیہ السلام نے ۵۲۰ ق م میں کی، اور وہ یہ کہ مسیح گدھے پر سوار ہو کر یروشلم میں داخل ہوگا۔ کتنے حکمران ہیں جو گدھے پر سوار ہو کر یروشلم میں داخل ہوں گے۔ آج کل تو ظاہر ہے لوگ مرسڈیز کاروں میں ہوتے ہیں، اس وقت بھی میرے خیال میں سو میں ایک چانس تھا۔

ساتویں پیش گوئی ہیکل کی تباہی سے متعلق ہے جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خود کی تھی۔ ۳۰ء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش گوئی کی اور چالیس سال بعد یہ پیش گوئی پوری ہوئی، جب رومی جرنیل ٹائی ٹس نے طویل محاصرے کے بعد یروشلم پر قبضہ کیا۔

اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا امکان پانچ میں سے ایک تھا۔ کیوں کہ یہودیوں کی بغاوت اور پھر ان کا کچلا جانا کچھ ایسا غیر متوقع نہیں تھا۔

آٹھویں پیش گوئی یہ کہ مسیح کو مصلوب کیا جائے گا۔

کتنے لوگ مصلوب ہوئے ہیں؟ ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس پیش گوئی کے پورے ہونے کا امکان دس ہزار میں سے ایک تھا۔

نویں پیش گوئی یہ کہ لوگ اس کے کپڑے آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا امکان، میرے خیال میں، سو میں سے ایک تھا۔

بے گناہ ہونے کے باوجود وہ اپنی موت کے لحاظ سے، گناہ گاروں اور امیر لوگوں کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ڈاکوؤں کے ساتھ مصلوب کیا گیا تھا۔ اس پیش گوئی کے پورا ہونے کا امکان ہزار میں سے ایک تھا۔

آخری پیش گوئی یہ کہ مصلوب ہونے کے بعد وہ دوبارہ جی اُٹھے گا۔ اس پیش گوئی کے ساتھ تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی قدر وابستہ کی ہی نہیں جا سکتی۔

اب ہم ذرا ان تمام پیش گوئیوں کے پورا ہونے کے امکانات کا حساب لگاتے ہیں...... یہ امکان ۲۸،۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میں سے ایک ہے۔

ایک آسان مثال یہ ہے کہ فرض کر لیجیے پوری ریاست ٹیکساس میں ایک ایک ڈالر کے سکوں کی ایک میٹر اونچی تہہ بچھا دی جائے اور پھر آپ کو اس میں سے ایک نشان زدہ سکہ ڈھونڈنے کو کہا جائے تو جس قدر امکان آپ کے وہ سکہ ڈھونڈ لینے کا ہے، اسی قدر امکان ان پیش گوئیوں کے پورا ہونے کا ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں کوئی امکان نہیں ہے۔

ایسی بہت سی دیگر پیش گوئیاں بھی ہیں اور یہ ثبوت ہیں اس بات کا کہ انجیل برحق ہے اور یہوواہ الوہیم کی جانب سے نازل شدہ ہے۔

انجیل ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ یہ ایک اچھی خبر ہے جب کہ قرآن ہمیں بُری خبر سناتا ہے، سورۂ نحل میں تحریر ہے:

﴿وَ لَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَیْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ یُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا

يَسْتَقْدِمُوْنَ○﴾ [النحل : ٦١]

''اگر کہیں اللہ لوگوں کو ان کی زیادتی پر فوراً ہی پکڑ لیا کرتا تو روئے زمین پر کسی متنفس کو نہ چھوڑتا۔لیکن وہ سب کو ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا ہے پھر جب وہ وقت آجاتا ہے تو اس سے کوئی ایک گھڑی بھر بھی آگے پیچھے نہیں ہوسکتا۔''

مسئلہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنی پوری کوشش کر لیں، ان کے بارے میں بھی قرآن محض ایک امکان ہی پیش کرتا ہے، یعنی ''شاید۔''

مثلاً سورۂ قصص میں کہا گیا:

﴿فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ ○﴾ [القصص : ٦٧]

''البتہ جس نے آج توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک عمل کیے، وہی یہ توقع کرسکتا ہے کہ وہاں فلاح پانے والوں میں سے ہوگا۔''

یعنی وہ بھی یقین نہ رکھے، بلکہ محض توقع ہی رکھ سکتا ہے۔اسی طرح سورۂ تحریم میں کہا گیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾

[التحریم : ٨]

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے توبہ کرو، خالص توبہ، بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں دُور کر دے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل فرما دے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔''

سورۂ توبہ میں تحریر ہے:

﴿اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ○﴾ [التوبہ : ١٨]

''اللہ کی مسجدوں کے آباد کار (مجاور و خادم) تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخر کو مانیں اور نماز قایم کریں، زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔ انہی سے یہ توقع ہے کہ سیدھی راہ چلیں گے۔''

یعنی بالآخر تنہائی ہے۔ اگر ایک شخص ایمان نہیں لاتا تو وہ یقینی طور پر جہنم میں جائے گا۔ لیکن اگر وہ ایمان لے بھی آتا ہے تو روزِ حشر وہ یک و تنہا خدا کے سامنے کھڑا ہوگا۔ نہ کوئی دوست ہوگا نہ سفارشی۔ اور محض توقع ہی کر سکتا ہے، امید ہی رکھ سکتا ہے کہ شاید وہ بخشے جانے والوں میں شامل ہو جائے۔ اور یہ بڑی سخت خبر ہے۔ مندرجہ بالا آیات میں لفظ ''عسیٰ'' استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے ''شاید، ہوسکتا ہے، امکان ہے'' وغیرہ۔

دوسری طرف انجیل میں ہمیں اچھی خبر ملتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

''میں خدمت کروانے کے لیے نہیں بلکہ خدمت کرنے کے لیے آیا ہوں تاکہ اپنی زندگی، بہت سی زندگیوں کے کفارے میں دے سکوں۔''

اسی طرح بائبل میں مزید کہا گیا ہے:

''اگر تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاؤ اور دل سے یہ یقین رکھو کہ خدا نے انھیں زندہ کر دیا تھا تو تمہاری نجات یقینی ہے۔''

یہ ایک حیرت انگیز طور پر خوش کن خبر ہے۔ آپ پوری ہونے والی پیش گوئیوں کو ثبوت کے طور پر پڑھیں۔ ۵۰۰ لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب ہونے کے بعد، زندہ دیکھا تھا۔ بہت سے آثارِ قدیمہ بھی ایسے دریافت ہوئے ہیں جو بائبل کی تائید کرتے ہیں۔

میں آپ سب کو یہ دعوت دیتا ہوں کہ آپ بائبل کا مطالعہ کریں۔ آپ کو اپنی روح کے لیے بہت سی خوش خبریاں ملیں گی۔ خدا آپ پر رحم کرے۔

بہت بہت شکریہ

جوابی خطاب

ڈاکٹر ذاکر نائیک

محترم ڈاکٹر ولیم کیمپبل صاحب، سٹیج پر تشریف فرما دیگر معززین، میرے بزرگو، بھائیو اور بہنو! میں آپ سب کو دوبارہ اسلامی طریقے سے خوش آمدید کہتا ہوں:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے میرے بیان کردہ بائیس نکات میں سے صرف دو نکات کو چھیڑا ہے۔ جی ہاں، صرف دو نکات کو۔

پہلا نکتہ جس کا انھوں نے جواب دینے کی کوشش کی وہ یہ تھا کہ بائبل میں کائنات کی تشکیل چھ دنوں میں ہونے کا بتایا گیا ہے، ان دنوں سے کیا مراد ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ان دنوں سے مراد طویل زمانے ہیں۔ اس بات کا جواب میں اپنی گفتگو میں پہلے ہی دے چکا ہوں کہ اگر آپ ''دن'' سے مراد ایک طویل زمانہ لیتے ہیں تو آپ چھ میں سے صرف دو مسائل حل کرتے ہیں، باقی چار مسائل حل طلب ہی رہ جاتے ہیں۔ آفرینش کائنات کے حوالے سے وہ ان مسائل کو تسلیم کرتے ہیں، یہ اچھی بات ہے۔

دوسرا نکتہ جس کا انھوں نے ذکر کیا، وہ مرقس کی انجیل میں بتائے گئے امتحان کے بارے میں تھا۔ اس حوالے سے انھوں نے بتایا کہ ان کے ایک دوست نے جس کا نام ہیری تھا یا جو کچھ بھی اس کا نام تھا، مراکش میں اس نے زہر کھایا اور اس پر اثر نہیں ہوا۔ لیکن انجیل تو کہتی ہے کہ:

''اور اگر کچھ ہلاک کرنے والی چیز پئیں گے تو انھیں کچھ ضرر نہ پہنچے گا۔''

[مرقس، باب ۱۶، ۱۸]

یہاں واضح طور پر پینے کا ذکر ہے، کھانے کا نہیں۔ لیکن پھر بھی میں ان کی بات مانے لیتا ہوں کہ کھانے یا پینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر کوئی زہر پینے کی بجائے کھالے تو بھی وہ اس امتحان میں پورا اُترے گا۔ لیکن ذرا تصور کیجیے ایک شخص، وہ بھی مراکش میں، وہ بھی فوت ہو چکا ہے، مجھے تو بتایا گیا ہے کہ دنیا میں دو ارب مسیحی ہیں۔ ان دو ارب لوگوں میں سے کوئی بھی آگے نہیں آئے گا؟

اور میرا تو خیال تھا کہ ڈاکٹر ولیم کیمپبل خود ایک صاحب ایمان مسیحی ہیں، وہ خود یہ امتحان دینے کے لیے آگے بڑھیں گے، نہ کہ ان کا دوست جو پہلے ہی فوت ہو چکا ہے۔

دوسری بات یہ تھی کہ وہ نئی نئی زبانیں بولیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا اس وقت وہ لوگ یہ زبانیں بولتے تھے۔ یہ امتحان دینا ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ آخر آپ کو ان چند زبانوں میں ایک ایک جملہ ہی بولنا تھا۔ ان زبانوں کو سمجھنے والے یہاں موجود ہوں گے۔

لیکن بات یہ ہے کہ میں اپنی زندگی میں ہزاروں مسیحیوں سے مل چکا ہوں اور ان میں سے کوئی ایک بھی اس امتحان میں پورا نہیں اُترا۔ اگر آج تک اس امتحان میں ناکام رہنے والوں کی تعداد ایک ہزار تھی تو آج ایک ہزار ایک ہوگئی ہے، کیوں کہ ڈاکٹر ولیم کیمپبل سے بھی ملاقات ہوگئی ہے۔

میرے بیان کردہ بائیس نکات میں سے ڈاکٹر ولیم نے انھی دو نکات کو چھیڑا اور باقی ماندہ بیس نکات کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اس کی بجائے انھوں نے پیش گوئیوں کی بحث شروع کر دی۔ پیش گوئیوں کا زیر بحث موضوع، یعنی ''بائبل اور جدید سائنس'' سے کیا تعلق ہے؟

اگر پیش گوئیاں ہی معیار ہیں تو پھر ناسٹراڈیمس کی کتاب بہترین کتاب ہے۔ اس بنیاد پر تو اسے کلامِ خداوندی تسلیم کر لیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر ولیم نے Theory of Probability کا ذکر کیا اور اس کا اطلاق بائبل کی پیش گوئیوں پر کیا۔ اگر آپ اس تھیوری کا درست اطلاق دیکھنا چاہتے ہیں تو میری کتاب ''قرآن اور سائنس'' [1] کا مطالعہ کیجیے۔

---

[1] ناشر دار النوادر، اُردو بازار، لاہور

اگر میں چاہوں تو انجیل کی انہی پیش گوئیوں کو غلط بھی ثابت کر سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ جتنی پیش گوئیوں کا ذکر انہوں نے کیا وہ سب مکمل طور پر درست ہیں لیکن ان کے طرزِ استدلال سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر انجیل کی ایک بھی پیش گوئی غلط ثابت ہو جائے تو اس کا مطلب ہو گا کہ یہ کتاب منزل من اللہ نہیں ہے۔ اور میں ایسی پیش گوئیوں کی پوری فہرست آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔

مثال کے طور پر کتاب پیدائش کے چوتھے باب کی بارھویں آیت میں قائن سے کہا گیا کہ:

''جب تو زمین کو جوتے گا تو وہ اب تجھے اپنی پیداوار نہ دے گی اور زمین پر تو خانہ خراب اور آوارہ ہو گا۔''

لیکن چند ہی سطروں کے بعد آیت نمبر ۱۷ میں پتہ چلتا ہے:

''اور اس نے ایک شہر بسایا اور اس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر حنوک رکھا۔''

یعنی پیش گوئی بالکل غلط ثابت ہوئی۔

اسی طرح یرمیاہ کے باب ۳۶ کی آیت ۳۰ میں ہم پڑھتے ہیں:

''اس لیے شاہ یہوداہ یہویقیم کی بابت خداوند یوں فرماتا ہے کہ اس کی نسل میں سے کوئی باقی نہ رہے گا جو داؤد کے تخت پر بیٹھے اور اس کی لاش پھینکی جائے گی تاکہ دن کو گرمی میں، رات کو پالے میں پڑی رہے۔''

لیکن اگر آپ سلاطین ۔۲ کے چوبیسویں باب کی چھٹی آیت کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ:

''اور یہویقیم اپنے باپ دادا کے ساتھ سو گیا اور اس کا بیٹا یہویاکین اس کی جگہ بادشاہ ہوا۔''

یعنی پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔

اگرچہ ایک ہی پیش گوئی کا غلط ہونا یہ ثابت کر دیتا ہے کہ موجودہ انجیل کلامِ خداوندی

نہیں ہے، لیکن میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔

حزقی ایل، باب ۲۶، کی آیت نمبر ۸ میں بتایا گیا ہے کہ بنوکدرضر، شاہِ بابل، صور کے شہر کو تباہ کرے گا لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ اس شہر کو سکندر اعظم نے تباہ کیا تھا۔ گویا یہ پیش گوئی بھی درست ثابت نہیں ہوئی۔

یسعیاہ، باب نمبر ۷، آیت ۱۴ میں کہا گیا ہے:

''دیکھو، ایک کنواری حاملہ ہوگی اور بیٹا پیدا ہوگا اور وہ اس کا نام عمانوایل رکھے گی۔''

اوّل تو یہاں غلط ترجمہ کیا جا رہا ہے کیوں کہ جو اصل عبرانی لفظ یہاں استعمال ہوا ہے، اس کا مطلب ''کنواری'' نہیں ہوتا بلکہ اس کے معنی ''جوان عورت'' ہیں۔ لیکن مسیحی حضرات کا کہنا ہے کہ یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کی جا رہی ہے۔ لہٰذا ہم ان کی مانے لیتے ہیں کہ واقعی یہاں لفظ کنواری استعمال ہوا ہے لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ اس کا نام عمانوایل ہوگا اور پوری بائبل میں کسی بھی جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عمانوایل کے نام سے نہیں پکارا گیا۔ لہٰذا بہرصورت یہ پیش گوئی غلط ثابت ہوئی۔

میں بہت سی مثالیں مزید بھی پیش کر سکتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا، ایک ہی مثال یہ ثابت کرنے کے لیے کفایت کرتی ہے کہ بائبل کلامِ خداوندی نہیں ہے۔ میں نے تو بہت سی مثالیں پیش کر دی ہیں۔ لہٰذا آپ کے پیش کردہ نظریے کے مطابق بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ بائبل کلامِ خداوندی نہیں ہے۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے میرے اُٹھائے ہوئے نکات کا جواب دینے کے علاوہ بھی چھ سات باتیں کی ہیں جن کا میں ان شاء اللہ اختصار کے ساتھ جواب ضرور دوں گا۔

انھوں نے ایک بات، میرے حوالے سے اور برادر شبیر علی کے حوالے سے یہ کی کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ قرآن کے مطابق چاند کی روشنی منعکس روشنی ہوتی ہے۔ جب کہ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

میں دوبارہ عرض کرتا ہوں، سورۂ فرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا﴾ [الفرقان: ٦١]

''بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔''

اس آیت میں سورج کو چراغ قرار دیا گیا ہے۔ اور چاند کے لیے لفظ قمر استعمال ہوا ہے۔ قمر کے ساتھ ہمیشہ منیر کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی منعکس یا مستعار روشنی کے ہیں۔ سورج کے لیے شمس کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور سورج کو ہمیشہ روشن چراغ ہی قرار دیا گیا ہے۔ میں حوالے پیش کرسکتا ہوں۔ مثال کے طور پر:

سورۂ نور، آیات ۱۵ اور ۱۶

سورۂ یونس، آیت ۵

اور اسی طرح متعدد دیگر آیات۔

انھوں نے مزید یہ کہا کہ اگر ''نور'' سے مراد منعکس روشنی ہے تو یہ لفظ سورۂ نور میں خود اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے بارے میں ارشاد ہے کہ وہی زمین وآسمان کا نور ہے۔

آپ پوری آیت کا مطالعہ کیجیے اور پھر دیکھیے کہ یہاں کیا کہا جارہا ہے؟

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ [النور: ٣٥]

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ (کائنات میں) اس کے نور کی مثال ایسی

ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہو، وہ چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا، اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے، (اس طرح) روشنی پر روشنی (بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں) ۔ اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے، رہنمائی فرماتا ہے، وہ لوگوں کو مثالوں سے بات سمجھاتا ہے، وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔''

اس آیت کے مطالعہ سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ اس مثال میں اگر اللہ تعالیٰ نور یعنی منعکس روشنی ہے تو اس روشنی کا منبع یا چراغ بھی وہ خود ہے۔ یعنی اس آیت میں جو مثال پیش کی گئی ہے اس میں روشنی بھی وہ خود ہے اور اس روشنی کا عکس بھی وہ خود۔ فانوس کی مثال دی گئی ہے جس کے اندر روشنی کا ذریعہ بھی ہوتا ہے اور یہ روشنی کو منعکس بھی کرتا ہے۔

ڈاکٹر ولیم نے کہا کہ قرآن بھی نور ہے۔ تو کیا یہ بھی عکس ہے؟ یقیناً قرآن اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ہدایات کی روشنی اور عکس ہے۔

مزید برآں انھوں نے حضرت محمد ﷺ کے سراج ہونے کا ذکر کیا۔ یقیناً وہ سراج ہیں جن کی روشنی کا عکس احادیث کی صورت میں ہم تک پہنچ رہا ہے۔ اور چونکہ وہ احکامات الٰہیہ ہم تک پہنچانے کا سبب ہیں لہٰذا اس لحاظ سے وہ نور بھی ہیں۔

لہٰذا آپ کسی بھی لحاظ سے دیکھیں، نور یا منیر کا مطلب منعکس، منعطف یا مستعار روشنی ہی بنتا ہے۔

دوسری بات ڈاکٹر ولیم نے سورۂ کہف کی آیت ۸۶ کے حوالے سے کی کہ ذوالقرنین نے سورج کو گدلے پانی میں ڈوبتا دیکھا۔ سورج کا گدلے پانی میں ڈوب جانا یقیناً غیر سائنسی بات ہے۔ لیکن یہاں عربی لفظ وَجَدَ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے نظر آنا۔ سو اللہ سبحانہ وتعالیٰ یہاں فرمارہے ہیں کہ ذوالقرنین کو ایسا نظر آیا۔

اگر میں کہوں کہ دوسری جماعت کے ایک بچے نے کہا کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ "ذاکر کہتا ہے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں۔" یہ میں نہیں کہہ رہا بلکہ آپ کو بتا رہا ہوں کہ بچہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں غلط نہیں کہہ رہا بلکہ وہ بچہ غلط کہہ رہا ہے۔

اس آیت کو سمجھنے کے متعدد طریقے ہیں۔ ایک تو یہی کہ وَجَدَ کے معانی پر غور کیا جائے، جو کہ ہیں "نظر آیا" اور محمد اسد کے بقول دوسرا طریقہ یہ کہ لفظ مغرب کے معانی پر غور کیا جائے۔ عربی کے لفظ مغرب کے دو معانی ہیں۔ ایک تو سمت کے لیے استعمال ہوتا ہے یعنی مغرب کی سمت (West) اور دوسرے وقت کے لیے یعنی غروب آفتاب کا وقت۔

لہٰذا اگر زیر نظر آیت میں غروب آفتاب کے مقام کی بجائے غروب آفتاب کا وقت مراد لیا جائے مسئلہ ہی حل ہو جاتا ہے۔ متعدد طریقوں سے اس آیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر ولیم اس پر اعتراض کریں اور کہیں کہ ہم باتیں فرض کر رہے ہیں اور ہمیں الفاظ کو ان کے ظاہری معانی میں ہی قبول کرنا چاہیے۔ چلیے اس نہج پر تجزیے کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جب ہم روزمرہ گفتگو میں سورج کے نکلنے اور غروب ہونے کا ذکر کرتے ہیں تو کیا ہم واقعی سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں؟ اخبارات میں ہم سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کے اوقات دیکھتے ہیں تو کیا اخبارات واقعی سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کا ذکر کر رہے ہوتے ہیں؟ سائنسی طور پر ہم سب جانتے ہیں کہ سورج نہ تو نکلتا ہے اور نہ ڈوبتا ہے؛ اصل میں یہ زمین کی گردش ہوتی ہے جس کے سبب ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے تو کیا یہ اخبارات [illegible] رہے ہوتے ہیں؟

جب میں لفظ Disaster استعمال کرتا ہوں تو میری مراد ایک بڑا حادثہ ہوتی ہے، یہ لفظ انھی معانی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے لغوی معانی "ایک منحوس ستارے" کے ہوتے ہیں تو کیا جب یہ لفظ استعمال کیا جائے تو ہمیں اس کے لغوی معانی ہی مراد لینے چاہئیں؟

میں اور ڈاکٹر ولیم دونوں بعض اوقات پاگل شخص کے لیے ایک لفظ استعمال کرتے ہیں

Lunatic، اس لفظ کے لغوی معانی ہوتے ہیں ''Struck by the Moon'' تو کیا ہم اس لفظ کو اس کے لغوی معانی ہی میں استعمال کرتے ہیں؟

لیکن بات یہ ہے کہ زبان کا ارتقا اسی طرح ہوا ہے۔ سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کو بھی اسی طرح دیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سورۂ کہف کی اس آیت میں سورج کے ڈوبنے سے کیا مراد ہے؟ یہاں کوئی بات سائنس کے خلاف نہیں ہے۔

انھوں نے سورۂ فرقان کا بھی حوالہ دیا ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا﴾ [الفرقان : ٤٥]

''تم نے دیکھا نہیں کہ تمھارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا۔''

ڈاکٹر ولیم اپنی کتاب میں اس آیت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''سورج کہاں حرکت کرتا ہے؟'' لیکن آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس آیت میں کہیں بھی سورج کی حرکت کا ذکر ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی گفتگو میں بھی اور اپنی کتاب میں بھی یہی سوال اُٹھاتے ہیں کہ سورج حرکت نہیں کرتا لیکن اس آیت مبارکہ میں تو صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ سورج کو سائے کی حرکت پر دلیل بنایا گیا ہے۔ اور یہ بات تو وہ شخص بھی جانتا ہے جس نے کبھی مدرسے کا منہ بھی نہیں دیکھا، کہ سائے کا سبب سورج کی روشنی ہوتی ہے۔ لہٰذا قرآن کی بات بالکل درست ہے۔ کیوں کہ قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ سورج کی حرکت کی وجہ سے سایہ گھٹتا بڑھتا ہے۔ یہ بات ڈاکٹر صاحب خود قرآن سے وابستہ کر رہے ہیں۔ سورج سائے پر دلیل ہے کیوں کہ سورج کی روشنی کی وجہ سے ہی سایہ گھٹتا بڑھتا ہے۔ اگر روشنی نہ ہو تو سایہ بھی نہیں ہوگا۔ سایہ تو ظاہر ہے دیگر روشنی کے ذرائع کی وجہ سے بھی بن سکتا ہے لیکن یہاں خاص سائے کی بات ہو رہی ہے جو گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی ہے اور یہ سایہ سورج کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر کیمپبل نے سلیمانؑ کی وفات کا بھی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے سورۂ سبا کی آیت کا حوالہ دیا ہے:

﴿فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ﴾ [سبا: ١٤]

''پھر جب سلیمانؑ پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز اس گھن کے سوا نہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا، اس طرح جب سلیمان گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔''

اس آیت کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک شخص چھڑی کے سہارے کھڑا ہو، وہ فوت ہو جائے اور کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔

اس آیت کریمہ کی وضاحت بھی متعدد طریقوں سے ممکن ہے۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ حضرت سلیمانؑ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور یہ ان کا ایک معجزہ ہوسکتا ہے۔ جب بائبل یہ کہتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے اور یہ کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے تو یہ بات حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ناقابل یقین ہوتی ہے۔ آپ خود بتائیے کسی مردے کا زندہ کر دینا اور بغیر باپ کے پیدا ہونا زیادہ حیرت انگیز ہے یا کسی مردہ شخص کا چھڑی کے سہارے کھڑے رہنا؟

سو اگر اللہ سبحانہ و تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعے معجزات ظاہر فرما سکتا ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ذریعے کیوں نہیں فرما سکتا؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے سمندر میں راستہ بن سکتا ہے، ان کا عصا اژدھے میں تبدیل ہوسکتا ہے، بائبل یہ بتاتی ہے، قرآن بھی یہی بتاتا ہے، سو اگر اللہ تعالیٰ کے لیے یہ ممکن ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام والا واقعہ کیوں ممکن نہیں ہے؟

متعدد دیگر تاویلات بھی ممکن ہیں کیوں کہ قرآن یہ تو کہہ ہی نہیں رہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ''بہت طویل عرصے'' تک چھڑی کے سہارے کھڑے رہے تھے...... سورۂ نسا میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا﴾ [النساء: ۸۲]

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔''

آپ کسی بھی نقطہ نظر سے قرآن کا مطالعہ کریں۔ اگر آپ کا طریقہ کار منطقی ہے تو آپ قرآن میں کہیں بھی تضاد اور اختلاف نہیں پائیں گے، اور نہ ہی قرآن کی کوئی آیت مصدقہ سائنسی حقایق کے خلاف ہوگی۔

میں ڈاکٹر ولیم کیمپبل سے اتفاق کرتا ہوں، حضرت سلیمان علیہ السلام طویل عرصہ تک کھڑے رہے ہوں گے اور اس کی وجہ بھی اسی جگہ بیان کر دی گئی ہے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام گرے ہیں اور جنوں کو ان کی وفات کا علم ہوا تو انھوں نے کہا کہ اگر ہمیں غیب کا علم ہوتا تو ہم اتنا عرصہ مشقت نہ کرتے۔ دراصل ان جنات کو اپنی طاقت کا بہت زعم تھا، جسے ختم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر واضح فرمایا کہ انھیں علم غیب حاصل نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے دودھ بننے کے عمل کا بھی ذکر کیا ہے۔ سورۂ النحل کی آیت کے حوالے سے انھوں نے اعتراض کیا ہے۔

سب سے پہلا شخص جس نے دورانِ خون کا عمل دریافت کیا وہ ابن نفیس تھا۔ اس نے یہ دریافت نزولِ قرآن کے چھ سو سال بعد کی تھی اور ابن نفیس کے بھی چار سو سال بعد ولیم ہاروی کے ذریعے یہ بات اہل مغرب کے علم میں آئی۔ یعنی نزولِ قرآن کے ایک ہزار سال بعد۔

جو غذا ہم کھاتے ہیں وہ معدے اور آنتوں میں ہضم ہوتی ہے۔ ہضم کے بعد خوراک

کے اجزا دورانِ خون کے ذریعے جسم کے مختلف اعضا تک پہنچتے ہیں۔ جگر کا فعل بھی اس عمل میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ دورانِ خون کے اس عمل کے ذریعے ہی غذائی اجزا دودھ پیدا کرنے والے غدودوں تک بھی پہنچتے ہیں۔

جدید سائنس کی فراہم کردہ یہ تمام معلومات اجمال واختصار کے ساتھ اس آیت قرآنی میں بیان کردی گئی ہیں:

﴿وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ﴾ [النحل: ٦٦]

''اور تمھارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے۔ ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم ایک چیز تمھیں پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ جو پینے والوں کے لیے نہایت خوش گوار ہے۔''

حمد وثنا اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں قرآن کے ذریعے چودہ سو سال پہلے ہی ان حقایق کا علم دیا، جن کے بارے میں جدید سائنس آج انکشافات کررہی ہے۔ سورۂ مومنون میں بھی ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ○﴾

[المؤمنون: ٢١، ٢٢]

''اور حقیقت یہ ہے کہ تمھارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے، اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمھیں پلاتے ہیں اور تمھارے لیے ان میں بہت سے دوسرے فایدے بھی ہیں۔ ان کو تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر سوار بھی کیے جاتے ہو۔''

ڈاکٹر ولیم نے حیوانوں کے گروہوں میں رہنے کے حوالے سے بھی ایک نکتہ اُٹھایا ہے۔ متعلقہ آیت کریمہ قرآن مجید کی سورۂ انعام میں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ۝﴾

[الانعام : ۳۸]

''زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔''

قرآن مجید تو یہ کہہ رہا ہے اور ڈاکٹر ولیم کہہ رہے ہیں کہ مکڑی اپنے نر کو ہلاک کر دیتی ہے اور شیر یوں کرتا ہے اور ہاتھی یوں کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

وہ رویوں کے بارے میں بات کر رہے ہیں، قرآن رویے کی بات ہی نہیں کر رہا۔ اگر ڈاکٹر ولیم کیمپبل قرآن کی بات نہیں سمجھ پائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن کی بات غلط ہے۔

قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ یہ انواع ہیں تمہاری طرح۔ یعنی جانوروں اور پرندوں کے بھی انسانوں کی طرح گروہ ہوتے ہیں۔ قرآن ان کے رویوں کی بات نہیں کر رہا۔

اور آج جدید سائنس بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ جانور اور پرندے بھی ہماری طرح گروہوں کی صورت میں ہی رہتے ہیں۔

میں علم الجنین کے حوالے سے تفصیلی گفتگو نہیں کر سکا تھا کیوں کہ وقت محدود تھا۔ ڈاکٹر ولیم کے اُٹھائے ہوئے تمام نکات کا جواب میں نے دے دیا ہے۔ اب ہم علم الجنین کے حوالے سے ذرا تفصیل سے بات کریں گے۔ جن نکات کا جواب میں دے چکا ہوں ان کے علاوہ ڈاکٹر ولیم نے کچھ باتیں کی ہیں۔ ایک بات انھوں نے یہ کی کہ جنین کی نشوونما کے مراحل کا ذکر Hippocritus اور گالن وغیرہ نے بھی کیا ہے۔ یہاں ایک بنیادی نکتہ سمجھ لینا ضروری ہے۔ اگر کسی نے کوئی ایسی بات کی ہے جس سے قرآن کو اتفاق ہے تو اس سے

یہ مراد لینا ہرگز درست نہ ہوگا کہ وہ بات قرآن نے اس شخص سے اخذ کی ہوگی۔ مثال کے طور پر میں ایک بیان دیتا ہوں اور فرض کیجیے کہ وہ بیان درست ہے۔ اب اگر وہی بیان مجھ سے پہلے بھی کوئی دے چکا ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ میں نے لازماً اس شخص کی نقل کی ہے یا اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس کا امکان ضرور ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ صورتِ حال کا تجزیہ کریں۔

قرآن گالن اور ہپوکریٹس وغیرہ کی ہر بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ جنین کے ارتقا کے حوالے سے قرآن اور گالن وغیرہ کے نظریات میں مکمل یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ اگر قرآن نے (نعوذ باللہ) ان سائنس دانوں کی نقل کی ہوتی تو دونوں میں مکمل یکسانیت پائی جاتی۔ یہ ایک منطقی بات ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ کچھ چیزوں کی تو نقل کر لی جاتی اور کچھ چیزیں جو غلط ہیں، وہ چھوڑ دی جاتیں۔ گالن اور ہپوکریٹس وغیرہ ''جونک نما مرحلے'' کا ذکر نہیں کرتے۔ ان کے ہاں ''مضغة'' کا تصور پایا ہی نہیں جاتا۔

مزید برآں ان سائنس دانوں نے یہ بھی کہا کہ عورت میں بھی مادۂ منویہ ہوتا ہے۔ اور یہی بات بائبل میں بھی کی گئی ہے۔ لہٰذا گالن اور ہپوکریٹس سے استفادہ دراصل انجیل میں کیا گیا ہے۔

بائبل میں ہم پڑھتے ہیں:

''کیا تو نے مجھے دودھ کی طرح نہیں اُنڈیلا اور پنیر کی طرح نہیں جمایا؟''

[ایوب۔ باب ۱۰۔۱۰]

یہ دودھ اور جمے ہوئے پنیر کا تذکرہ کیا ہے؟ سیدھی سیدھی گالن کی نقل ہے۔ نقل کیوں؟ کیوں کہ یہ جملہ کلامِ الٰہی نہیں ہے۔ یہ بات غلط ہے۔ دراصل یہ گالن، ہپوکریٹس اور دیگر یونانیوں کا خیال تھا کہ جنین کی تشکیل جمے ہوئے پنیر کی طرح ہوتی ہے۔ اور بائبل میں یہ بات بعینہٖ نقل کر لی گئی ہے۔ قرآن میں ہرگز ایسا نہیں ہے۔

اگر آپ علم الجنین کے حوالے سے لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کریں، مثال کے طور پر

ڈاکٹر کیتھ مور کی کتاب دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ گالن، ہپوکریٹس اور ارسطو وغیرہ نے اس موضوع پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی۔ اُن کی کچھ باتیں درست ہیں تو بہت سی باتیں غلط بھی ہیں۔

ڈاکٹر مور مزید لکھتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ یا اس وقت کے عربوں کے لحاظ سے قرآن ہمیں اضافی معلومات فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر کیتھ مور اپنی کتاب میں قرآن کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ وہ ارسطو اور ہپوکریٹس کا بھی اعتراف کرتے ہیں لیکن یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان کی باتیں غلط بھی ہیں۔ قرآن کے کسی بیان کے بارے میں وہ ایسا نہیں کہتے۔ یہی اِس بات کا کافی ثبوت ہے کہ قرآن، یونانی نظریات کی نقل نہیں کر رہا۔

رہی بات چاند کی روشنی اور زمین کی گردش کی، تو مجھے فیثا غورث کے بارے میں بھی پتہ ہے اور یہ بھی کہ زمانہ قبل مسیح میں ہی بعض یونانیوں کا خیال تھا کہ زمین گردش میں ہے، چاند کی روشنی دراصل سورج کی روشنی کا عکس ہے۔

لیکن .... اگر رسول اللہ ﷺ (نعوذ باللہ) ان نظریات کی نقل کر رہے ہوتے تو پھر وہ ان کے اس نظریے کو بھی قبول کرتے کہ سورج ساکن ہے اور پوری کائنات کا مرکز ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہوا کہ درست باتیں قبول کر لی گئیں اور غلط باتیں چھوڑ دی گئیں۔

ڈاکٹر ولیم کیمپبل ایک طویل فہرست پیش کر دیتے ہیں۔ یونانی زبان سے Cyriac میں ترجمہ ہوا، اس سے عربی میں ہوا، لیکن قرآن کی ایک آیت اس طرزِ استدلال کی نفی کر دینے کے لیے کفایت کرتی ہے۔

سورۂ عنکبوت میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ [العنکبوت: ۴۸]

”(اے نبی ﷺ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہ پڑھتے تھے، اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔“

رسول اللہ ﷺ اُمی تھے وہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ یہ تاریخی حقیقت یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ انھوں نے کہیں سے، کسی سے نقل نہیں کی۔ دیکھیے، تصور کیجیے، ایک سائنس دان، تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی یہ سب کچھ معلوم نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر بھی حکمت کے تحت رسول اللہ ﷺ کو اُمّی رکھا، تاکہ لوگوں کو، متکبر لوگوں کو، اسلام کے خلاف کتابیں لکھنے والے لوگوں کو، منہ کھولنے کا موقع نہ ملے۔

میں بائبل کے حوالے سے بہت سی باتیں کر سکتا ہوں۔ لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے میں ڈاکٹر ولیم کی جانب سے اُٹھائے گئے تمام نکات کا جواب دے چکا ہوں، الحمد للہ۔ کوئی ایک نکتہ بھی ایسا نہیں بچا جس سے قرآن کا سائنس کے خلاف ہونا ثابت ہو۔

انھوں نے میرے اُٹھائے ہوئے ۲۲ نکات میں سے صرف دو نکات کو چھیڑا اور انہیں بھی ثابت نہیں کر سکے۔ لہٰذا یہ بائیس کے بائیس نکات ثابت کرتے ہیں کہ بائبل جدید سائنس سے مطابقت نہیں رکھتی۔

اب نکتہ نمبر ۲۳ پیش خدمت ہے۔ یہ نکتہ علم الحیوانات سے متعلق ہے۔

کتاب احبار، باب ۱۱ کی چھٹی آیت دیکھیں:

”اور خرگوش کو کیوں کہ وہ جگالی تو کرتا ہے لیکن اس کے پاؤں الگ نہیں۔ وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے۔“

یہاں واضح طور پر کہا جا رہا ہے کہ خرگوش جگالی کرتا ہے۔ حالاں کہ آج ہم سب جانتے ہیں کہ خرگوش جگالی نہیں کرتا، اور نہ ہی اس کے معدے کی بناوٹ جگالی کرنے والے جانوروں کی سی ہوتی ہے۔ دراصل اس کے منہ کی مسلسل حرکت کی وجہ سے زمانۂ قدیم میں ایسا سمجھا جاتا تھا۔

اسی طرح امثال، باب ۶، آیت ۷ میں کہا گیا کہ چیونٹیوں کا نہ کوئی سردار ہے، نہ ناظر اور نہ حاکم۔ آج ہم جانتے ہیں کہ چیونٹیاں نہایت منظم مخلوق ہیں۔ ان کے ہاں ایک باقاعدہ نظام پایا جاتا ہے جس کے مطابق وہ محنت کرتی اور خوراک جمع کرتی ہیں۔ ان میں

باقاعدہ سردار چیونٹی بھی ہوتی ہے اور نیچے درجہ بدرجہ کارکن چیونٹیاں ہوتی ہیں۔
یہ ایک سائنسی حقیقت ہے جسے بائبل نظرانداز کرتی ہے، لہٰذا بائبل کا بیان غیر سائنسی ہے۔

کتاب پیدائش، باب ۳، آیت ۱۴ اور پھر یسعیاہ، باب ۶۵، آیت ۲۵ میں کہا گیا ہے کہ سانپ کی خوراک خاک ہے۔ حیاتیات کی کوئی کتاب ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ سانپ کی خوراک خاک ہے۔

مزید برآں بائبل میں ایسے جانوروں کا ذکر بھی موجود ہے جو سرے سے وجود ہی نہیں رکھتے مثلاً ایک دیو مالائی جانور Unicorn۔ یہ ایک سینگ والا گھوڑا ہے جو صرف اساطیر میں پایا جاتا ہے، حقیقی دنیا میں وجود نہیں رکھتا۔

میرا وقت ختم ہونے والا ہے۔ اگر میری کسی بات سے کسی مسیحی بھائی کے جذبات مجروح ہوئے ہیں تو میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ میری نیت کسی کے جذبات مجروح کرنے کی نہیں تھی۔ مجھے تو ڈاکٹر کیمپبل کا جواب دینا ہے اور ان کی کتاب کا رد کر کے یہ ثابت کرنا ہے کہ قرآن اور جدید سائنس میں مکمل مطابقت پائی جاتی ہے۔

اور جہاں تک بائبل کا تعلق ہے، اس کے ایک حصے کے بارے میں تو ہم یہ امکان تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کلامِ خداوندی ہوسکتا ہے لیکن مجموعی طور پر، اس کی موجودہ صورت میں ہم بائبل کو منزل من اللہ نہیں سمجھتے۔

اب میں اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔ میں اپنی بات قرآن کریم کی اس آیت پر ختم کرنا چاہوں گا:

﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ٥﴾

[بنی اسرائیل: ۸۱]

''اور اعلان کر دو کہ ''حق آ گیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔''

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

حصہ دوئم

سوالات وجوابات

سوال:......میرا سوال ڈاکٹر کیمپبل سے ہے۔ کتاب پیدائش میں کہا گیا ہے کہ طوفان نوح پوری دنیا میں آیا تھا۔ دنیا کی ہر چیز، ہر پہاڑ اس میں ڈوب گیا تھا۔ دوسری طرف یہ بھی کہا جارہا ہے کہ پانی پندرہ ہاتھ اونچا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ دنیا کا بلندترین پہاڑ پندرہ ہاتھ اونچا نہیں تھا۔ پھر اس بات کا کیا مطب ہے؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:......سوال کے لیے شکریہ۔ میرے خیال میں بائبل یہ کہہ رہی ہے کہ بلندترین پہاڑ سے بھی پانی پندرہ ہاتھ اونچا تھا۔ یعنی اگر بلندترین پہاڑ تین ہزار میٹر بلند تھا تو پانی کی بلندی تین ہزار میٹر اور پندرہ ہاتھ تھی۔

اور میرا خیال ہے کہ قرآن بھی طوفانِ نوح کا بیان اسی طریقے سے کرتا ہے:

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَ مَنْ اٰمَنَ وَ مَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ٥﴾ [هود: ٤٠]

''یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور وہ تنور اُبل پڑا تو ہم نے کہا کہ ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو، اور اپنے گھر والوں کو بھی، سوائے ان اشخاص کے جن کی نشان دہی پہلے کی جا چکی ہے، اس میں سوار کرادو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح کے ساتھ ایمان لائے تھے۔''

اس کے بعد قرآن مختلف علاقوں کا ذکر کرتا ہے اور انبیائے کرام کی فہرست دیتا ہے، جس میں نوح سے پہلے کا کوئی نبی شامل نہیں۔ حالاں کہ حضرت آدم عَلَیْہِ السَّلَام بھی نبی ہو سکتے تھے۔ بہرحال میرے خیال میں قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ یہ طوفان پوری دنیا میں آیا تھا۔

سوال:......ڈاکٹر ذاکر صاحب! آپ نے اپنی گفتگو کے دوران میں کہا کہ اللہ نور ہے، میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔ وضاحت کردیجیے۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بھائی نے یہ سوال اس لیے کیا ہے کہ وہ ڈاکٹر ولیم

کے جواب میں میری گفتگو کو سمجھ نہیں پائے جو اللہ اور نور کے حوالے سے تھی۔ قرآن مجید کی سورۂ نور کی پینتیسویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [النور: ۳۵]

''اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔''

نور کا مطلب منعکس یا مستعار روشنی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا تھا کہ کیا اللہ تعالیٰ کی روشنی بھی مستعار ہے؟ اس سوال کے جواب میں کہا گیا تھا کہ اگر آپ اس آیت کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں فانوس کی مثال دی گئی ہے۔ فانوس میں ایک چراغ ہوتا ہے جو اپنی روشنی رکھتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی روشنی رکھتا ہے۔ فانوس روشنی منعکس بھی کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اس روشنی کو نور کہنا بھی روا ہے۔

آپ یہاں یہ ہیلوجن لیمپ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے راڈ کو آپ سراج یا وہاج یا چراغ کہہ سکتے ہیں۔ جب کہ اس کے Reflecter کو منیر کہا جا سکتا ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس روشنی سے مراد عام روشنی نہیں ہے بلکہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی روحانی روشنی ہے۔ لیکن ظاہر ہے ڈاکٹر ولیم کیمپبل کو جواب دینے کے لیے جتنی ضرورت تھی میں نے اتنی ہی بات کی۔

البتہ چونکہ میرے پاس جواب کے لیے پانچ منٹ ہیں لہٰذا میں ایک اور بات بھی کرنا چاہوں گا۔ ڈاکٹر ولیم کیمپبل نے حضرت نوحؑ کا ذکر کیا ہے۔ دیکھیے میں بائبل کے حق میں Concordance Approch اور قرآن کے حق میں Conflict Approch استعمال کر رہا ہوں کیوں کہ الحمد للہ کسی بھی صورت میں قرآن برحق ہی ثابت ہوتا ہے۔

اگر میں ڈاکٹر ولیم کی بات مان بھی جاؤں اور یہ بات تسلیم کر بھی لوں کہ طوفانِ نوحؑ کا پانی دنیا کے بلند ترین پہاڑ سے بھی پندرہ ہاتھ بلند تھا تو ایک اور مسئلہ سامنے آتا ہے۔ کتاب پیدائش کے باب نمبر ۷ آیت نمبر ۱۹ اور ۲۰ میں کہا گیا ہے:

''اور پانی زمین پر چڑھتا ہی گیا اور بڑھا اور کشتی پانی کے اوپر تیرتی رہی اور

پانی زمین پر بہت ہی زیادہ چڑھا اور سب اونچے پہاڑ جو دنیا میں ہیں پانی میں چھپ گئے۔''

اگر آپ طوفانِ نوحؑ کے وقت کا تعین انجیل کی مدد سے کریں تو یہ اکیسویں یا بائیسویں صدی قبل مسیح کا دور بنتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب بابل میں تیسرے اور مصر میں گیارھویں خاندان کی حکومت چل رہی تھی۔ لیکن وہاں اس طوفان کا کوئی اثر نہیں ملتا۔ یعنی یہ علاقے طوفان سے بالکل محفوظ رہے۔ پس آثارِ قدیمہ کی شہادت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ طوفانِ نوحؑ کا عالم گیر ہونا یعنی پوری زمین پر محیط ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

رہا یہ سوال کہ قرآن اس بارے میں کیا کہتا ہے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن تاریخ کا تعین نہیں کرتا۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ سیلاب بائیسویں صدی قبل مسیح میں آیا تھا یا پچاسویں صدی قبل مسیح میں آیا تھا۔

دوسری بات یہ کہ قرآن کہیں یہ نہیں کہتا کہ سیلاب عالم گیر تھا اور ساری زمین اس میں ڈوب گئی تھی۔ قرآن صرف حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کا ذکر کرتا ہے جو ایک چھوٹی قوم بھی ہوسکتی ہے اور بڑی بھی۔

آج ماہرین آثارِ قدیمہ یہ امکان تو تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کا ایک مخصوص علاقہ زیرِ آب آ گیا ہو لیکن عالم گیر سیلاب کا نظریہ کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ لہٰذا الحمد للہ قرآن تو جدید ترین علوم کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے، لیکن بائبل نہیں۔

مزید برآں اگر آپ کتاب پیدائش کے چھٹے باب کی پندرھویں اور سولہویں آیت کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ خدا حضرت نوحؑ کو حکم دیتا ہے:

''اور ایسا کرنا کہ کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ، اس کی چوڑائی پچاس ہاتھ اور اس کی اونچائی تیس ہاتھ ہو۔''

اگر آپ حساب لگائیں تو پتہ چلتا ہے کہ کشتی کا کل حجم ڈیڑھ لاکھ مکعب فٹ سے زیادہ نہیں بنتا اور رقبہ بھی تقریباً ۳۳،۷۵۰ مربع فٹ بنتا ہے۔ بائبل کہتی ہے کہ کشتی تین منزلہ تھی

یعنی کل رقبہ تقریباً ایک لاکھ مربع فٹ تھا۔ یہ کل دستیاب جگہ تھی۔ ذرا تصور کیجیے، دنیا کے ہر جاندار کا ایک جوڑا اس ایک لاکھ مربع فٹ میں آنا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے؟

دنیا میں لاکھوں اقسام کے جاندار ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس آڈیٹوریم میں ایک لاکھ لوگ آئے تو کیا آپ تسلیم کر لیں گے؟ مجھے یاد ہے، پچھلے سال میں نے کیرالہ میں ایک خطاب کیا تھا۔ وہاں دس لاکھ لوگ آئے تھے۔ وہ میری زندگی کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ تاحد نظر لوگ ہی لوگ تھے۔ میں آخر تک دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ لیکن وہ ایک ملین لوگ کسی آڈیٹوریم میں نہیں تھے۔ یہ لوگ ساحل سمندر پر جمع ہوئے تھے۔ میں سامنے کے چند لوگوں کے علاوہ باقی لوگوں کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر آپ اس اجتماع کی ویڈیو دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ایک لاکھ لوگ کس قدر ہوتے ہیں۔ اسی طرح عرفات کے اجتماع سے بھی آپ کو اندازہ ہوسکتا ہے جہاں ڈھائی ملین لوگ جمع ہوتے ہیں۔

لہٰذا ایک لاکھ مربع فٹ رقبے میں لاکھوں جانداروں کا رہنا بالکل ناممکن ہے جب کہ انھوں نے اسی جگہ میں چالیس دن رہنا بھی ہو کھانا پینا بھی ہو اور حوائج ضروریہ سے بھی فارغ ہونا ہو۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی بائبل کی سائنسی اغلاط میں سے ہے۔

سوال:...... ڈاکٹر ولیم کیمپبل، آپ بائبل میں دیا گیا امتحان خود کیوں نہیں دیتے تاکہ یہاں موجود حاضرین پر یہ بات ثابت ہو جائے کہ آپ ایک حقیقی مسیحی ہیں؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:...... مجھے ڈاکٹر ذاکر نائیک کی تاویل سے اتفاق نہیں ہے۔ دیکھیے، خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بھٹکانے کی کوشش کی گئی تھی۔ شیطان نے ان سے کہا کہ اگر آپ ابن اللہ ہیں تو ہیکل سے نیچے چھلانگ لگا دیں۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ خدا کا امتحان نہیں لینا چاہیے۔ میں بھی خدا کا امتحان لینے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں یہاں آپ کے سامنے معجزہ دکھانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میرے دوست ہیری نے دعوت میں جانے کا وعدہ کیا تھا اور اس نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ لیکن وہ صورتِ حال مختلف تھی۔ میں خدا کی اقتدار پر ایمان رکھتا ہوں

سوال:...... مسیحی حضرات عقیدہ تثلیث کی سائنسی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ جس طرح پانی کی تین طبعی صورتیں ٹھوس، مایع اور گیس ہوسکتی ہیں یعنی وہ برف، پانی اور بھاپ کی شکل میں ہوسکتا ہے۔ اسی طرح خدا بھی باپ، بیٹے اور روح القدس کی تثلیث کی صورت میں ہے۔ کیا آپ اس تاویل کو درست سمجھتے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں ایک وضاحت چاہوں گا۔ یہ بات درست ہے کہ ہمیں خدا کا امتحان لینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے لیکن یہ کوشش کون کر رہا ہے؟ ہم تو ڈاکٹر ولیم کا امتحان لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ صاحب ایمان پر یہ خطرناک زہر اثر نہیں کرے گا اور وہ نئی نئی زبانیں بولیں گے۔ ہم خدا کا امتحان نہیں لے رہے۔ خدا پر ہمارا ایمان ہے کہ وہ ہر صاحب ایمان کو اس امتحان میں کامیاب کرے گا۔ ہم تو آپ کا امتحان لے رہے ہیں کہ آپ صاحب ایمان مسیحی ہیں یا نہیں؟

اب میں بہن کے سوال کی طرف آتا ہوں۔ ان کا سوال یہ ہے کہ مسیحی حضرات عقیدۂ تثلیث کی سائنسی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ ''جس طرح پانی تین صورتوں یعنی ٹھوس، مایع اور گیس میں پایا جاتا ہے، اسی طرح خدا بھی باپ، بیٹے اور روح القدس کی صورت میں موجود ہے۔

سائنسی لحاظ سے مجھے اس بات سے پورا اتفاق ہے کہ پانی کی تین طبعی حالتیں ہوتی ہیں۔ ٹھوس، مایع اور گیس یا برف، پانی اور بخارات۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اپنے اجزا کے لحاظ سے یہ ایک ہی چیز رہتی ہے۔ پانی کا کیمیائی فارمولا H_2O ہے یعنی دو ایٹم ہائیڈروجن کے اور ایک ایٹم آکسیجن کا۔ یہ اجزا اسی طرح رہتے ہیں، ان کا تناسب یہی رہتا ہے صرف طبعی حالت تبدیل ہوتی ہے۔

اب ہم عقیدۂ تثلیث کا جائزہ لیتے ہیں۔ باپ، بیٹا اور روح القدس۔ کیا یہاں بھی صرف حالت ہی تبدیل ہوتی ہے؟ چلیے ہم مان لیتے ہیں کہ یہاں بھی صرف حالت کا فرق

پڑتا ہے، کیا یہاں بھی اجزا وہی رہتے ہیں؟

باپ اور روح القدس کا وجود روحانی ہے جب کہ انسان گوشت پوست کی مخلوق ہے۔ انسان کو زندہ رہنے کے لیے کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ خدا ان ضرورتوں سے پاک ہے۔ دونوں مختلف ہیں دونوں ایک جیسے کس طرح ہو سکتے ہیں؟

اور یہ بات خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بیان سے بھی ثابت ہوتی ہے، وہ لوقا کی انجیل میں فرماتے ہیں:

> ''اس نے ان سے کہا ''تم کیوں گھبراتے ہو؟ اور کس واسطے تمہارے دل میں شک پیدا ہوتے ہیں؟ میرے ہاتھ اور میرے پاؤں دیکھو کہ میں وہی ہوں۔ مجھے چھو کر دیکھو کیوں کہ روح کے گوشت اور ہڈی نہیں ہوتی جیسا کہ مجھ میں دیکھتے ہو، یہ کہہ کر اس نے انھیں اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے۔ جب مارے خوشی کے ان کو یقین نہ آیا اور تعجب کرتے تھے تو اس نے ان سے کہا کیا یہاں تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟ انہوں نے اسے بھنی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا۔ اس نے لے کر ان کے روبرو کھایا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہاں خود فرما رہے ہیں کہ روح گوشت اور ہڈیاں نہیں رکھتی۔ سائنسی طور پر یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ وہ خدا نہیں ہیں، انھوں نے ان کے روبرو مچھلی کا ٹکڑا کھایا اور اس طرح باپ بیٹے اور روح القدس کے ایک ہونے یعنی تثلیث کے عقیدے کو خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ردّ کر دیا۔

پوری بائبل میں تثلیث (Trinity) کا لفظ ہی موجود نہیں ہے۔ لیکن قرآن میں اس کا ذکر موجود ہے۔

سورۂ نسا میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾

[النساء: ۱۷۱]

''اور نہ کہو کہ تین ہیں۔ باز آ جاؤ یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی خدا ہے۔''

سورۂ مائدہ میں پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَ اِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۝﴾ [المائدہ: ۷۳]

''یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔ حالاں کہ ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے، اس کو دردناک سزا دی جائے گی۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خدا ہیں۔ بائبل میں بھی تثلیث کا تصور موجود نہیں ہے۔

واحد بیان جو تثلیث کے قریب ترین ہو سکتا ہے، یہ ہے:

''اور جو گواہی دیتا ہے وہ روح ہے کیوں کہ روح سچائی ہے۔ اور گواہی دینے والے تین ہیں، روح، پانی اور خون۔ اور یہ تینوں ایک ہی بات پر متفق ہیں۔''

[یوحنا کا پہلا خط۔ باب ۵۔ ۷]

اور اس آیت کے بارے میں بائبل کے Revised Standard Version میں یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ یہ آیت الحاقی ہے۔ یعنی اسے بائبل سے نکال ہی دیا گیا ہے، گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی دعویٰ الوہیت نہیں کیا۔

پوری بائبل میں کوئی ایک بیان بھی ایسا موجود نہیں جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہو کہ میں خدا ہوں۔ یا یہ کہا ہو کہ میری عبادت کرو۔ بلکہ اگر آپ بائبل کا مطالعہ کریں تو آپ کو اس قسم کی آیات ملیں گی:

''اگر تم مجھ سے محبت رکھتے تو اس بات سے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں

خوش ہوتے کیوں کہ باپ مجھ سے بڑا ہے۔'' [یوحنا۔ باب۱۴۔۲۸]

''میرا باپ سب سے بڑا ہے۔'' [یوحنا۔ باب۱۰۔۲۹]

''میں خدا کی روح کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں۔'' [متی۔ باب۱۲۔۲۹]

''میں بدروحوں کو خدا کی قدرت سے نکالتا ہوں۔'' [لوقا۔ باب۱۱۔۲۲]

''میں اپنے آپ سے کچھ نہیں کرسکتا۔'' [یوحنا۔ باب۵۔۳۰]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمارہے ہیں کہ میں اپنے آپ سے کچھ نہیں کرسکتا۔ یعنی جو کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کی مرضی سے کرتا ہوں۔ اور یہی اسلامی عقیدہ ہے۔ مسلمان ہوتا ہی وہ ہے جو اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع کردے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمان تھے اور اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبروں میں سے ایک تھے۔

ہمارا ایمان ہے کہ ان کی پیدایش ایک معجزہ تھا۔ ہمارا ایمان ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کردیتے تھے، اندھوں اور کوڑھیوں کو ٹھیک کردیتے تھے۔ ہم ایک عظیم الشان پیغمبر کے ہونے کی حیثیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن وہ خدا نہیں ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

﴿هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾

سوال:......ڈاکٹر ولیم کیمپبل، کیا آج کی گفتگو کے بعد آپ کو کوئی فایدہ ہوا ہے؟ کیا اسلام کی حقانیت کی جانب آپ کو کوئی اشارہ ملا ہے؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:...... دیکھیے، میں گزشتہ سوال کو آپ کے سوال کا جواب دینے کے لیے استعمال کروں گا۔ ڈاکٹر نائیک کہتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے کہیں یہ نہیں کہا کہ وہ خدا ہیں۔ حالاں کہ مرقس کی انجیل میں ارشاد ہوتا ہے:

''سردار کاہن نے اس سے پھر سوال کیا اور کہا کیا تو اس ستودہ کا بیٹا مسیح ہے؟ یسوع نے کہا ہاں میں ہوں اور تم ابن آدم کو قادر مطلق کے دائیں طرف بیٹھے آسمان کے بادلوں کے ساتھ آتے دیکھو گے۔'' [مرقس۔ باب۵۔۶۱]

یہاں وہ خود کو واضح طور پر خدا کا بیٹا اور الوہی قرار دے رہے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ذاکر نائیک صرف انھی آیات کا حوالہ دے رہے ہیں جن کا حوالہ وہ دینا چاہتے ہیں۔ یعنی جن آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بشری پہلو کا ذکر ہے۔ لیکن دیگر آیات میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں اور باپ ایک ہی ہیں۔

خدا گوشت پوست کی صورت اختیار کر کے ہمارے بیچ رہا.......... رہا میرے دوست کا سوال کہ کیا میں نے آج کی گفتگو سے کچھ سیکھا ہے؟ تو یقیناً ہم نے کئی باتیں سیکھی ہیں، اور میں ہمیشہ سیکھنے کے لیے تیار رہتا ہوں۔ لیکن میرا خیال یہی ہے کہ جن پانچ سو گواہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مرنے کے بعد زندہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا، ان کی گواہی میرے لیے زیادہ مضبوط ہے بہ نسبت چھ سو سال بعد آنے والے محمدؐ کی تنہا گواہی کے۔

سوال:......ڈاکٹر ذاکر، اپنی گفتگو کے دوران ڈاکٹر کیمپبل نے قرآن کے تصورِ کائنات کے حوالے سے کچھ غلط باتیں کیں، جن کا جواب آپ نے دیا۔ لیکن بائبل جو کچھ زمین کی ساخت وغیرہ کے بارے میں کہتی ہے اس کا ذکر آپ نے نہیں کیا؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:......بہن نے پوچھا ہے کہ میں نے اس بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی کہ بائبل زمین کی ساخت کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ میرے پاس وقت محدود تھا۔ میں ایسے سو نکات مزید بیان کر سکتا ہوں جنھیں میں نے وقت کی کمی کی وجہ سے نہیں چھیڑا۔

بہر حال بہن جاننا چاہتی ہے کہ بائبل زمین کی ساخت کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ بائبل میں کہا گیا ہے:

> ''پھر ابلیس اسے ایک بہت اونچے پہاڑ پر لے گیا اور دنیا کی سب سلطنتیں اور ان کی شان و شوکت اسے دکھائی۔'' [متی۔ باب ۴۔ ۸]

اب بات یہ ہے کہ آپ دنیا کے بلند ترین پہاڑ پر ہی کیوں نہ چلے جائیں۔ آپ ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر ہی کیوں نہ چلے جائیں اور فرض کیجیے آپ بہت دُور تک دیکھ بھی

سکتے ہوں، ہزاروں میل تک دیکھ سکتے ہوں، پھر بھی آپ دنیا کی تمام سلطنتیں نہیں دیکھ سکتے۔ کیوں کہ آدھی دنیا زمین کے دوسری طرف ہوگی۔ کسی اونچے مقام سے پوری دنیا کو دیکھنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر زمین چپٹی ہو۔ اور یہی بائبل بتاتی ہے کہ زمین چپٹی ہے۔ پھر زمین کے بارے میں اسی طرح کا بیان بائبل میں ایک اور جگہ بھی موجود ہے:

''میں نے نگاہ کی اور کیا دیکھتا ہوں کہ زمین کے وسط میں ایک نہایت اونچا درخت ہے۔ وہ درخت بڑھا اور مضبوط ہوا اور اس کی چوٹی آسمان تک پہنچی اور وہ زمین کی انتہا تک دکھائی دینے لگا۔'' [دانی ایل۔ باب ۴۔۱۰]

مندرجہ بالا صورتِ حال بھی صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر زمین چپٹی ہو۔ کیوں کہ اگر زمین گول ہے تو پھر زمین کی دوسری طرف سے اس درخت کو کبھی نہیں دیکھا جا سکے گا۔

لیکن آج یہ بات ایک طے شدہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہے کہ زمین گول ہے۔ مزید برآں تواریخ۔ ا، باب ۱۶، آیت ۳۰ میں کہا گیا ہے کہ:

''جہان قایم ہے اور اسے جنبش نہیں۔''

یہ بات بائبل میں دوسری جگہ بھی کی گئی ہے کہ زمین حرکت نہیں کرتی۔

ایک بات ڈاکٹر کیمپبل کے اس بیان کے حوالے سے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ کہا ہے کہ میں خدا ہوں۔ آپ میری کتاب ''مذاہب عالم میں تصورِ خدا'' [1] میں تمام حوالہ جات ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ جو حوالے ڈاکٹر کیمپبل نے دیے ہیں انھی کو سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی ایسا دعویٰ نہیں کیا۔

سوال:......ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب! آپ کہتے ہیں کہ قرآن میں کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں گرامر کی ۲۰ غلطیاں دکھا سکتا ہوں، مثال کے طور پر سوۂ بقرہ میں، سورۂ حج میں، سورہ طٰہٰ میں، کیا آپ ان غلطیوں کی وضاحت کر سکتے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بھائی نے بڑا اچھا سوال پوچھا ہے۔ انھوں نے

[1] ناشر دار النوادر، اُردو بازار، لاہور

قرآن میں گرامر کی بیس غلطیوں کی بات کی ہے۔ جس کتاب کے حوالے سے وہ بات کر رہے ہیں وہ عبدالفادی کی کتاب ہے "Is Quran Infalbibile" میں ان ۲۰ غلطیوں کی وضاحت اکٹھی ہی کر دوں گا۔ میں یہ کتاب بھی پڑھ چکا ہوں اور میرے بھائی میں ان سب غلطیوں کا جواب دیتا ہوں۔

پہلی بات تو سمجھنے کی یہ ہے کہ عربی زبان کی تمام تر گرامر لی ہی قرآن سے گئی ہے۔ قرآن عربی زبان وادب کا اعلیٰ ترین معیار اور حوالہ ہے۔ عربی گرامر کی نصابی کتاب ہی قرآن مجید ہے۔ جب قرآن ہی نصاب ہے اور قرآن ہی سے گرامر اخذ کی گئی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ گرامر کی کوئی غلطی قرآن میں ہو ہی نہیں سکتی۔

آپ کے پاس پیمائش کے لیے ایک آلہ ہے۔ اسی آلے سے پیمائش کر کے آپ نے صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا ہے۔ اس پیمانے کو آپ کس طرح غلط کہہ سکتے ہیں۔ یہ غیر منطقی بات ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ مختلف عرب قبائل کی زبان میں فرق موجود ہے۔ ڈاکٹر ولیم بھی جانتے ہوں گے کہ زبان میں تبدیلی مختلف قبائل کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ ایک لفظ کو ایک قبیلہ مونث سمجھتا ہے تو دوسرے لوگ اسے مذکر قرار دیتے ہیں۔ تذکیر و تانیث کا اختلاف بھی موجود ہے اور گرامر کا بھی۔

اس صورتِ حال میں آپ ان عرب قبائل کی زبان اور گرامر کو معیار بنا کر قرآن کی زبان کے بارے میں کوئی فیصلہ کس طرح صادر کر سکتے ہیں؟ قرآن کا معیارِ فصاحت و بلاغت اتنا بلند ہے کہ قرآن پر کوئی اعتراض اس حوالے سے ہو ہی نہیں سکتا۔

کیا آپ جانتے ہیں، اس حوالے سے متعدد کتابیں موجود ہیں۔ انٹرنیٹ پر کوئی بارہ غلطیاں گنوا رہا ہے اور کوئی بیس غلطیاں۔ آپ کا کیا خیال ہے، یہ غلطیاں تلاش کرنے والے کون ہیں؟ کیا یہ غیر مسلم ہیں؟ نہیں یہ مسلمان ہی ہیں۔ زامک شریف جیسے لوگ۔ یہ لوگ کرتے کیا ہیں۔ یہ جانتے ہیں کہ قرآن کا معیار اس قدر بلند ہے کہ بعض اوقات قرآن

گرامر کے عام اُصولوں سے بلند ہو کر بات کرتا ہے۔ اور قرآن کے اسی بلند معیار کو ثابت کرنے کے لیے ایسی مثالیں علما پیش کرتے ہیں۔

انھی مثالوں کو بعض لوگ غلطیاں بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ میں ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں اور آپ کو بیس کی بیس غلطیوں کا جواب مل جائے گا۔

حضرت لوط علیہ السلام کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ انھوں نے پیغمبروں کا انکار کیا، اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کے حوالے سے بھی کہا گیا ہے کہ انھوں نے پیغمبروں کا انکار کیا لیکن ہم جانتے ہیں کہ ان اقوام کی طرف ایک ایک پیغمبر کو مبعوث کیا گیا تھا۔ کیا قرآن کو واحد کا صیغہ استعمال کرنا چاہیے تھا۔ ایک عام آدمی کے لحاظ سے یہ بھی گرامر کی غلطی ہے لیکن جو لوگ عربی ادب سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہی قرآنی اسلوب کا حُسن ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ تمام انبیائے کرام کا بنیادی پیغام ایک ہی تھا۔ لہٰذا ایک کا انکار درحقیقت سب کا انکار ہے۔

آپ نے قرآن کی بلاغت اور حسن ملاحظہ فرمایا۔ کوئی کہتا رہے کہ یہ غلطی ہے لیکن یہ غلطی ہرگز نہیں ہے۔

اسی طرح انیس شورش جیسے لوگ کہتے ہیں کہ ''کن فیکون'' غلط ہے کیونکہ صیغہ ماضی کے لحاظ سے کن فکان ہونا چاہیے۔ لیکن یہاں بھی وہ قرآنی بیان کے حُسن کو نہیں سمجھ پائے۔ یہاں جان بوجھ کر ماضی کا صیغہ نہیں استعمال کیا گیا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ماضی میں ایسا کیا اور وہ حال اور مستقبل میں بھی ایسا کر سکتا ہے۔

سوال:......ڈاکٹر کیمپبل، اپنی گفتگو کی ابتدا میں آپ نے فرمایا کہ ذوالقرنین، سکندر اعظم تھا۔ کیا آپ بتائیں گے کہ آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ ذوالقرنین دراصل سکندر اعظم تھا؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:......میں نے یہ بات عبداللہ یوسف علی کے ترجمہ قرآن کے حواشی میں پڑھی تھی۔ لیکن اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ذوالقرنین اصل میں سکندر اعظم ہی تھا یا کوئی اور۔ اصل بات یہ ہے کہ سورج گدلے پانی میں نہیں ڈوبتا جب کہ قرآن

کی آیت یہی کہہ رہی ہے۔

سوال:...... بائبل میں کہا گیا ہے کہ یونس علیہ السلام تین دن اور تین رات مچھلی کے پیٹ میں رہے تھے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام تین دن اور تین رات زمین کے پیٹ میں رہیں گے، کیا یہ پیش گوئی پوری ہوئی؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بہن جس آیت کا حوالہ دے رہی ہے وہ متی کی انجیل کے بارھویں باب میں ہے:

''اس پر بعض فقیہوں اور فریسیوں نے جواب میں اس سے کہا کہ اے استاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس نے جواب دے کر ان سے کہا اس زمانہ کے بُرے اور زنا کار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ نبی کے نشان کے علاوہ کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔ کیوں کہ جیسے یوناہ تین رات دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ویسے ہی ابن آدم تین رات دن زمین کے اندر رہے گا۔''

دیکھیے اس پیش گوئی میں واضح طور پر حضرت یونس علیہ السلام کی مثال دی گئی ہے کہ جس طرح وہ تین راتیں اور تین دن مچھلی کے پیٹ میں رہے، اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام تین راتیں اور تین دن زمین کے پیٹ میں رہیں گے لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہونے کی جو داستان ہمیں بائبل سناتی ہے اس کے مطابق تو انھیں جمعہ کے دن مصلوب کیا گیا۔ رات گئے دفن کیا گیا اور اتوار کو قبر خالی تھی۔ یہ دو دن بھی نہیں بنتے بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک دن اور دو راتیں بنتی ہیں۔ تین دن اور تین راتیں نہیں۔

ڈاکٹر ولیم اپنی کتاب میں اس بات کا جواب دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دن کے ایک حصے کو پورا دن شمار کیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک مریض ہفتے کی شب بیمار ہوا ہو، اگر پیر کے دن میں اس سے پوچھوں کہ وہ کتنے دن سے بیمار ہے تو وہ یہی جواب دے گا کہ تین دن سے۔

ہم ان کی بات مان لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ اسی طرح ہو گا۔ لیکن پیر کے دن کوئی

مریض یہ ہرگز نہیں کہے گا کہ تین دن اور تین راتیں۔ میں چیلنج کرتا ہوں۔ میں نے الحمد للہ بہت مریض دیکھے ہیں اور ان میں مسیحی مریض بھی شامل تھے۔ لیکن کسی بھی مریض نے جو گزشتہ پرسوں رات کو بیمار ہوا ہو یہ کبھی نہیں کہا کہ میں تین دنوں اور تین راتوں سے بیمار ہوں۔ جب کہ بائبل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرما رہے ہیں تین دن اور تین راتیں۔ لہٰذا یہ ایک ریاضیاتی غلطی ہے۔

سائنسی لحاظ سے تقابل حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ کیا جائے تو یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ تین دن مچھلی کے پیٹ میں کیسے رہے؟ زندہ یا مردہ؟ جواب ہوگا زندہ۔ مچھلی تین دن انہیں زندہ لے کر سمندر میں پھرتی رہی۔ وہ زندہ تھے، جب انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی۔ جب مچھلی نے انھیں ساحل پر اُگلا تو وہ زندہ تھے۔ زندہ، زندہ، زندہ۔

لیکن جب پوچھا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تین دن زمین میں کیسے رہے تو جواب کیا ہوگا؟ زندہ یا مردہ؟

اگر وہ مردہ تھے تو پیش گوئی پوری نہیں ہوئی، اگر زندہ تھے تو پھر وہ مصلوب ہی نہیں ہوئے۔ میں اپنے ایک خطاب میں اس موضوع پر گفتگو کر چکا ہوں کہ حضرت مسیح علیہ السلام مصلوب ہوئے تھے یا نہیں؟ اور درست بات وہی ہے جو قرآن بتاتا ہے یعنی:

﴿وَ مَا قَتَلُوْهُ وَ مَا صَلَبُوْهُ وَ لٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ﴾ [النساء: ۱۵۷]

”حالانکہ فی الواقع انھوں نے نہ اس کو قتل کیا اور نہ صلیب پر چڑھایا۔ بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔“

سوال:......ڈاکٹر ولیم کیمپبل، آپ ایک ڈاکٹر ہیں، کیا آپ بائبل کے طبی بیانات کی وضاحت کریں گے، کیوں کہ آپ نے اپنے جوابی خطاب میں ان چیزوں کا جواب نہیں دیا۔ مثال کے طور پر خون کا جراثیم کش کے طور پر استعمال؟ یا بیٹی کی پیدائش کی صورت میں عورت کا دگنے عرصے تک ناپاک رہنا؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:......شکریہ میں آپ کے سوال کی طرف آتا ہوں۔ لیکن

ہو یہ رہا ہے کہ ڈاکٹر ذاکر نائیک سے وہ سوالات کیے جا رہے ہیں جو ایک مسیحی سے کیے جانے چاہئیں۔ بائبل کا اگر آپ مطالعہ کریں تو اس میں تین دن اور تیسرے دن کے الفاظ مترادفات کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے ان تمام الفاظ کا ایک ہی مطلب ہے۔

دوسری بات یہ کہ جب جمعرات کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ میرا وقت آ چکا ہے۔ لہٰذا میں تین دن اور تین رات کو اس وقت سے گنتا ہوں۔

یہ میرا کام نہیں کہ وضاحت کروں کہ خدا نے ان آیات میں کیا کہا ہے لیکن یہ میرا ایمان ہے کہ بائبل میں یہ باتیں خدا کی طرف سے ہیں۔

سوال:......اسلام ہمیں ارتقا کے بارے میں کیا بتاتا ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:......اس سوال کے مکمل جواب کے لیے آپ میری کتاب ''قرآن اور سائنس'' [1] سے رجوع کر سکتے ہیں۔ جب آپ ڈارون کے نظریہ ارتقا کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو ڈارون کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ایک جہاز میں، جس کا نام ایچ، ایم، ایچ بیگل تھا، ایک سفر پر نکلا، جزائر میں گیا، وہاں اس نے مشاہدات کیے اور اس کے نتیجے میں قدرتی چناؤ کا نظریہ وضع کیا۔

لیکن اس نے اپنے ایک دوست تھامس تھامپٹن کو ایک خط لکھا جس میں اس نے کہا کہ میں ''قدرتی چناؤ کے نظریے کے لیے کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکتا لیکن چوں کہ اس سے مجھے مدد ملتی ہے لہٰذا میں نے اسے اپنا لیا ہے۔''

ڈارون کا نظریہ محض ایک نظریہ ہے، کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے۔ اور میں نے اپنی گفتگو کی ابتدا میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ قرآن نظریات اور مفروضوں کے خلاف تو ہو سکتا ہے، کیوں کہ یہ نظریات بعض اوقات بالکل ہی اُلٹے ہو جایا کرتے ہیں، لیکن آپ قرآن اور کسی ثابت شدہ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں پائیں گے۔

---

[1] ناشر دار النوادر، اُردو بازار، لاہور

ہمارے سکولوں میں ڈارون کا نظریہ اس طرح پڑھایا جا رہا ہے جیسے یہ کوئی ثابت شدہ حقیقت ہو، حالاں کہ یہ نظریہ ہرگز ثابت شدہ نہیں۔ اس کا کوئی سائنسی ثبوت موجود نہیں اور پھر یہ کہ بہت سی کڑیاں گم شدہ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہم نے کسی دوست سے مذاق کرنا ہو یا اس کی تضحیک کرنی ہو تو کہتے ہیں کہ ''اگر تم ڈارون کے وقت میں ہوتے تو اس کا نظریہ درست ثابت ہو جاتا۔'' جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ بندر نما ہے۔

میں ان چاروں طرح کے فوسلز کے بارے میں جانتا ہوں جو دستیاب ہیں لیکن اس کے باوجود کئی کڑیاں گم شدہ ہیں۔

حیاتیات کے بارے میں قرآن ہمیں بتاتا ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾[الانبیاء: ۳۰]

''اور (ہم نے) پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔''

آج ہم جانتے ہیں کہ ہر زندہ مخلوق کی بنیادی اکائی خلیہ ہے اور خلیہ بیش تر سائٹوپلازم پر مشتمل ہوتا ہے جو کہ تقریباً نوے فی صد پانی ہوتا ہے۔ ہر زندہ مخلوق پچاس فی صد سے نوے فی صد پانی پر مشتمل ہوتی ہے۔ کیا عرب کے صحراؤں میں کسی کو یہ اندازہ ہو سکتا تھا یا ایسا خیال بھی آ سکتا تھا کہ ہر زندہ چیز پانی سے بنی ہے۔

اور قرآن یہ حقیقت ۱۴۰۰ برس پہلے بیان کر چکا ہے۔

سوال:...... اگر ڈاکٹر کیمپبل بائبل میں موجود تضادات کی وضاحت نہیں کر سکتے تو کیا انھیں تسلیم نہیں کر لینا چاہیے کہ بائبل غیر سائنسی ہے اور منجانب اللہ نہیں ہے؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:...... میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس حوالے سے مجھے کچھ مسائل درپیش ہیں لیکن میرا ایمان ہے کہ رسولوں کی پیش گوئیاں درست ہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی اصل بنیاد ہیں جن کے گرد یہ ساری عمارت تعمیر ہوئی ہے۔ حواریوں نے یہ انجیلیں انھی پیش گوئیوں کے پورا ہونے پر تحریر کیں۔

میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے سوال کا جواب نہیں ہے۔ لیکن میرا ایمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہے۔

سوال:...... کیا متن اور ترجمہ ایک ہی چیز ہے؟ اگر نہیں تو کیا موجودہ انگریزی بائبل وہی انجیل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... ''متن'' اور ''ترجمہ'' دو مختلف الفاظ ہیں۔ جو دو مختلف معانی رکھتے ہیں، لہٰذا سائنسی طور پر آپ ایک متن اور اس کے ترجمے کو ایک ہی چیز نہیں قرار دے سکتے۔

کیا حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر وحی انگریزی زبان میں نازل ہوئی تھی؟ یہ ایک بہت اچھا سوال ہے کہ کیا متن اور ترجمہ ایک ہی چیز ہو سکتے ہیں؟ جواب ہے ''نہیں'' متن اور ترجمہ کبھی ایک چیز نہیں ہو سکتے۔ ترجمہ متن کے قریب ترین ہو سکتا ہے لیکن متن کا نعم البدل کبھی نہیں ہو سکتا۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے کہا تھا کہ ترجمے کے لحاظ سے دنیا کی سب سے مشکل کتاب قرآن مجید ہے کیونکہ قرآن کی زبان اس قدر بلیغ ہے، اس قدر بلند ہے، اس قدر عظیم ہے کہ اس کا ترجمہ مشکل ترین کام ہے۔ ایک ایک لفظ کے متعدد معانی ہیں۔ اگر ترجمے میں کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو یہ انسانی کام ہے لہٰذا وہ انسانی غلطی ہو گی۔ اور ترجمہ کرنے والا اس کے لیے موردِ الزام ہو گا نہ کہ اللہ تعالیٰ۔

بائبل انگریزی میں نازل نہیں ہوئی تھی۔ عہد نامہ قدیم عبرانی زبان میں تحریر ہوا تھا جب کہ عہد نامہ جدید یونانی زبان میں۔

اگرچہ عیسیٰ علیہ السلام عبرانی زبان بولتے تھے لیکن انجیل کا مسودہ یونانی زبان میں ہے۔ اصل عبرانی مسودہ دستیاب نہیں ہے۔ بلکہ کیا آپ جانتے ہیں کہ عہد نامہ قدیم کا عبرانی متن بھی دراصل یونانی زبان سے دوبارہ عبرانی ترجمہ ہے۔ یعنی عہد نامہ قدیم کا اصل عبرانی متن بھی دستیاب نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں دوہرا مسئلہ ہے۔ چنانچہ اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے

کہ اس میں بہت سی اغلاط موجود ہیں۔

لیکن قرآن کا معاملہ الحمد للہ یہ ہے کہ اصل عربی متن ہی محفوظ ہے۔ آپ سائنسی طور پر ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ اصل متن ہے۔

لیکن ہمارا یقین اسی بات پر ہے جو قرآن میں کر دی گئی ہے:

﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ﴾[الرعد: ۳۸]

یقیناً ''تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں۔''

ان رسولوں پر کتابیں بھی نازل ہوئی تھیں۔ جن میں سے چار کے ناموں کا بھی ذکر کیا گیا ہے یعنی توراۃ، زبور، انجیل اور قرآن۔ توراۃ سے مراد وہ وحی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر، انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جب کہ قرآن حضرت محمد ﷺ پر۔ لیکن موجودہ بائبل ہرگز وہ انجیل نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔

سوال:...... کیا موجودہ بائبل وہی انجیل ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:...... موجودہ انجیل وہی ہے جو ہمیشہ سے تھی۔ ہمارے پاس متون موجود ہیں۔ ۵۷ فی صد متن تو ایسا ہے جو ۱۸۰ء سے موجود ہے۔ یعنی تحریر کیے جانے کے تقریباً سو برس بعد کے وقت سے یہ متن موجود ہیں۔ یوحنا نے اپنی زندگی میں یہ متن تحریر کیا۔ جب وہ متن تحریر کر رہے تھے تو اُس وقت کے بہت سے لوگ ابھی زندہ تھے۔ وہ اور ان کے باپ دادا یوحنا کے ذریعے ایمان لائے تھے۔ یہ متن کی صحت کا کافی ثبوت ہے۔ انجیل کی ایک مصدقہ تاریخ موجود ہے۔

باقی خدا ہر چیز پر قادر ہے.......... جو چاہے کر سکتا ہے.......... اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو منتخب کیا.......... اصل بات یہ ہے کہ پیش گوئیوں کے پورا ہونے کا کس قدر امکان تھا؟ شکریہ

سوال:...... سائنس تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اگر قرآن اور سائنس میں اتنی ہی مطابقت ہے جتنی آپ بتا رہے ہیں تو پھر اس صورت میں کیا ہوگا، اگر سائنسی نظریات تبدیل

ہو جائیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :......سوال بہت اہم ہے، کہ قرآن اور جدید سائنس کے درمیان مطابقت ثابت کرنے کے لیے اتنی محنت کی جاتی ہے۔ اگر جدید سائنس غلط ثابت ہو جائے تو پھر کیا ہوگا؟ کیا سائنس میں ہونے والی تبدیلیوں کے لحاظ سے قرآن بھی بدل جاتا ہے۔ یہ ایک بہت اچھا سوال ہے۔ اور قرآن کی مطابقت جدید سائنس کے ساتھ ثابت کرتے ہوئے ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

اسی لیے میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں ہی یہ بات واضح کر دی تھی کہ صرف اور صرف مصدقہ حقائق کے بارے میں ہی بات کروں گا، سائنسی نظریات اور مفروضوں کے بارے میں نہیں۔ کیوں کہ مصدقہ حقائق، ثابت شدہ حقائق تبدیل نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر یہ حقیقت کہ دنیا گول ہے۔ ثابت شدہ حقائق یوٹرن نہیں لیتے۔ لیکن غیر ثابت شدہ، غیر مصدقہ نظریات کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یوٹرن بھی لے سکتے ہیں۔

میں ایسے علما کے بارے میں بھی جانتا ہوں جو ڈارون کے نظریہ ارتقا کا ثبوت قرآن سے دینے کی کوشش کرتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ ایک نامعقول بات ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ رویہ قطعاً نہیں اپنانا چاہیے کہ ہر چیز کو، جدید سائنس کے ہر نظریے کو قرآن سے ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دیں۔ ہمیں پہلے دیکھنا چاہیے کہ نظریے کی حیثیت ایک ثابت شدہ حقیقت کی ہے یا محض مفروضے کی۔ مفروضہ درست بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی۔

مثال کے طور پر بگ بینگ کے نظریے (Big Bang Theory) ہی کو دیکھیے۔ آج اس کی حیثیت کی حقیقت کیا ہے لیکن کل یہ محض ایک مفروضہ تھا۔ جب مفروضہ حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے تو پھر ہم اسے استعمال کر سکتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ نسل انسانی کا ارتقا جینز کے ایک جوڑے سے ہوا ہے اور جینز ہی آدم وحوا تھے۔ لیکن میں اس نظریے کو کبھی اپنی گفتگو میں زیر بحث نہیں لاتا کیونکہ یہ نظریہ ابھی تک محتاج ثبوت ہے۔

چنانچہ قرآن اور سائنس کی مطابقت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ آپ مصدقہ حقائق کی بنیاد پر گفتگو کریں مفروضوں کی بنیاد پر نہیں۔

قرآن سائنس سے بدرجہا برتر ہے۔لہٰذا جدید سائنس کے ذریعے قرآن کی حقانیت ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا۔قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت جدید سائنس سے فراہم نہیں کر رہا، ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو صرف یہ کرتا ہوں کہ چونکہ ایک مسلمان کے برعکس ایک غیر مسلم اور دہریے کے لیے شاید اصل معیار جدید سائنس ہو لہٰذا میں انھی کے معیار، انھی کے پیمانے کو استعمال کرتے ہوئے قرآن کی برتری کا ثبوت فراہم کرتا ہوں، تاکہ وہ قرآن پر ایمان لائیں۔

سوال:...... اگر ڈاکٹر کیمپبل ان اعتراضات کا جواب دینے سے معذور ہیں جو ڈاکٹر ذاکر نائیک نے پیش کیے ہیں تو کیا وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بائبل میں اغلاط موجود ہیں؟

ڈاکٹر ولیم کیمپبل:...... یہ وہی سوال ہے جو پہلے بھی پوچھا جا چکا ہے۔ بات یہ ہے کہ بائبل میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی وضاحت کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں فوری طور پر ان باتوں کا جواب نہیں دے سکتا لیکن میں انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھے ان باتوں کا جواب مل جائے۔ بہت سی باتوں کے حوالے سے بائبل کی حقانیت آثارِ قدیمہ کی دریافت سے ثابت ہوئی ہے۔ یعنی علاقوں اور بادشاہوں وغیرہ کے حوالے سے بائبل کے بیانات کی حقانیت ثابت ہوئی ہے اور یہ بائبل کی صداقت کا ایک بہترین ثبوت ہے۔

سوال:...... کیا بائبل اور قرآن میں تضادات موجود ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... اس سوال کی مجھے مکمل طور پر سمجھ تو نہیں آئی۔ آپ قرآن کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں یا بائبل کے بارے میں؟ بہر حال میں دونوں سوالات کا جواب دے دیتا ہوں۔

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، سورۂ نساء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَ لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا﴾ [النساء: ۸۲]

"کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔"

لہٰذا قرآن میں تو تضاد کی کوئی ایک بھی مثال موجود نہیں ہے اور جہاں تک سوال ہے بائبل کا تو صورت یہ ہے کہ بائبل کے تضادات گنوانے کے لیے پانچ منٹ کا وقت بہت تھوڑا ہے۔ بلکہ اگر مجھے پانچ دن بھی دے دیے جائیں تو پھر بھی یہ وقت تھوڑا ہے...........!!

☆...........☆...........☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن اور سائنس

ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم

علیم احمد

ایڈیٹر ماہنامہ گلوبل سائنس، کراچی

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن اور سائنس

ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم

علیم احمد

ایڈیٹر ماہنامہ گلوبل سائنس، کراچی

دار النوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

۱۴۲۹ ہجری ۲۰۰۸ء

کتاب : قرآن اور سائنس

مصنف : ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم : مترجم

اہتمام : دارالنوادر، لاہور

مطبع : موٹروے پریس، لاہور

قیمت : ۴۰ روپے

ڈسٹری بیوٹرز

نفیس بک

فضلی بک سپر مارکیٹ

اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔

فون: 2212991-2629724

کتاب سرائے

پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ

اُردو بازار، لاہور فون: 7320318 فیکس: 7239884

ای میل: hikmat100@hotmail.com

ترتیب

تعارف

جب سے اس سیارہ زمین پر نوعِ انسانی کا ظہور ہوا ہے، تب سے انسان نے ہمیشہ یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ نظامِ فطرت (نظامِ قدرت) کیسے کام کرتا ہے، تخلیقات و مخلوقات کے تانے بانے میں اس کا اپنا مقام کیا ہے اور یہ کہ آخر خود زندگی کا کیا مقصد و مصرف ہے۔ سچائی کی اسی تلاش میں، جو صدیوں کی مدت اور متنوع تہذیبوں پر پھیلی ہوئی ہے، منظم مذاہب نے انسانی طرزِ حیات کی تشکیل کی ہے اور، ایک وسیع تر تناظر میں تاریخ کے دھارے کا تعین بھی کیا ہے۔ بعض مذاہب کی بنیاد تحریر شدہ عبارات و فرمودات پر رہی ہے، جن کے بارے میں ان کے پیروکاروں کا دعویٰ ہے کہ وہ خدائی یا الوہی ذرائع سے ملنے والی تعلیمات کا حاصل ہیں، جبکہ بعض دیگر مذاہب کا دارومدار خالصتاً انسانی تجربے پر رہا ہے۔

قرآن پاک، جو اسلامی عقیدے کا مرکزی ماخذ بھی ہے، ایک ایسی کتاب ہے جسے (اسلام کی) پیروی کرنے والے لوگ، یعنی مسلمان، مکمل طور پر خدائی یا الوہی (یا آسمانی) ذرائع سے نازل شدہ تسلیم کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں، قرآن پاک کے بارے میں مسلمانوں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ اس میں رہتی دنیا تک تمام بنی نوع انسان کے لیے ہدایت موجود ہے۔ چونکہ قرآن پاک کا پیغام ہر زمانے، ہر عہد اور ہر دَور کے لوگوں کے لیے ہے، لہٰذا اسے ہر دور کی مطابقت میں ہونا چاہیے۔ لیکن کیا قرآن پاک اس کسوٹی پر پورا اُترتا ہے؟

اس مختصر سی کتاب میں مسلمانوں کے اس عقیدے کا خارجی تجزیہ (Objective analysis) پیش کیا جائے گا جو وہ قرآن پاک کے الہامی ذریعے سے ہونے کے بارے میں رکھتے ہیں۔ اس امر کا جائزہ بطورِ خاص ثابت شدہ سائنسی دریافتوں کی روشنی میں پیش کیا جائے گا۔

انسانی تاریخ میں ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب ''معجزہ'' یا وہ چیز جو معجزہ تصور کی جاتی تھی،

اپنے زمانے کے انسانی علم، دلیل اور منطق سے آگے ہوا کرتی تھی۔ معجزے کی عمومی تعریف بھی یہی ہے کہ ایسی کوئی چیز جو عام انسانی زندگی کے برخلاف ہو اور جس کی عقلی وضاحت انسان کے پاس نہ ہو۔

تاہم، کسی بھی چیز کو معجزے کے طور پر قبول کرنے سے پہلے ہمیں بہت محتاط ہونا پڑے گا۔ مثلاً ۱۹۹۳ء میں ''ٹائمز آف انڈیا'' بمبئی میں ایک خبر شائع ہوئی، جس میں ''بابا پائلٹ'' نامی ایک سادھو نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ پانی سے بھرے ایک ٹینک میں لگاتار تین دن اور تین راتوں تک زیرِآب رہا ہے۔ البتہ جب رپورٹروں نے اُس ٹینک کی تہہ کا جائزہ لینے کی کوشش کی جس میں اس نے یہ ''معجزاتی کارنامہ'' دکھایا تھا تو اس نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ جوابی دلیل کے طور پر اس نے صحافیوں سے یہ کہا کہ کسی کو یہ اجازت کیسے دی جا سکتی ہے کہ وہ رحمِ مادر (Womb) کا تجزیہ کرے کہ جس سے بچہ جنم لیتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ''سادھو جی'' کچھ نہ کچھ چھپانا چاہ رہے تھے! اُن کا یہ دعویٰ محض شہرت حاصل کرنے کی ایک چال تھی۔ یقیناً جدید دور کا کوئی بھی شخص جو معقولیت پسندانہ سوچ (Ratinonal Thinking) کی جانب تھوڑا سا رجحان بھی رکھتا ہوگا، ایسے کسی نام نہاد ''معجزے'' کو قبول نہیں کرے گا۔ اگر ایسے جھوٹے اور بے بنیاد معجزے ہی ''من جانب اللہ'' ہونے کا پیمانہ ہیں تو (نعوذ باللہ) ہمیں دنیا کے سارے مشہور جادوگروں کو جن کی وجہِ شہرت ہی ان کے شعبدے اور بصری دھوکے ہیں، خدا کے اصل نمایندوں کے طور پر قبول کرنا پڑے گا۔

ایک ایسی کتاب جس کے آسمانی ذریعے سے نازل شدہ (یعنی من جانب اللہ) ہونے کا دعویٰ کیا جارہا ہے، اسی بنا پر ایک معجزہ ہونے کی دعویدار بھی ہے۔ اس دعوے کو کسی بھی زمانے میں اُسی زمانے کے (عقلی) معیارات کی مطابقت میں باآسانی قابلِ توثیق (Verifiable) ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری اور حتمی کتاب ہے، جو تمام تر معجزات سے بھی بڑھ کر معجزہ ہے، جسے بنی نوعِ انسان کی فلاح کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ لہٰذا اب ہم اس عقیدے کی درستگی کا عقلی جائزہ لیتے ہیں۔

قرآن پاک کا چیلنج:

تمام تہذیبوں میں انسانی قوتِ بیان اور تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے اہم ذرائع میں ادب اور شاعری سرفہرست رہے ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسے زمانے بھی گزرے ہیں جب شاعری اور ادب کو (معاشرے میں) ویسا ہی اعلیٰ وارفع مقام حاصل تھا جیسا کہ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کو حاصل ہے۔

غیر مسلم ماہرین لسانیات تک کا اس پر اتفاق ہے کہ عربی ادب کا سب سے بلند پایہ نمونہ قرآن پاک ہی ہے، یعنی اس روئے زمین پر عربی ادب کی بہترین سے بھی کہیں بڑھ کر بہترین مثال صرف قرآن پاک ہے۔ نوعِ انسانی کو قرآن پاک کا چیلنج ہے کہ وہ آیاتِ قرآنی کے ہم پلہ کچھ بنا کر دکھائے۔

﴿ وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲، آیت ۲۳ تا ۲۴)

''اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہو کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اُتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر دکھاؤ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے، تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر۔ جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لیے۔''

قرآن پاک واضح الفاظ میں (تمام انسانوں کو) چیلنج کر رہا ہے کہ وہ ویسی ہی ایک سورۃ بنا کر تو دکھائیں جیسی کہ قرآن پاک میں موجود ہیں یہ چیلنج قرآن پاک میں کئی مقامات پر دیا گیا ہے۔ صرف ایک ایسی سورۃ بنانے کا چیلنج، جو اپنی خوبصورتی، خوش بیانی، معانی کی وسعت

اور فکر کی گہرائی میں قرآن پاک کی برابری کر سکے، آج تک پورا نہیں کیا جا سکا ہے۔

تاہم جدید دور کا معقولیت پسند آدمی ایسے کسی مذہبی صحیفے کو قبول نہیں کرے گا، جو بہترین ادبی وشاعرانہ زبان استعمال کرنے کے باوجود یہ کہتا ہو کہ زمین چپٹی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ہم ایک ایسے زمانے میں جی رہے ہیں جہاں انسان کے عقلی دلائل، منطق اور سائنس کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو قرآن پاک کے من جانب اللہ ہونے کے ثبوت میں اس کی غیر معمولی اور بلند پایہ ادبی زبان کو بطور ثبوت کافی خیال نہیں کریں گے۔ کوئی بھی ایسا صحیفہ، جو آسمانی (اللہ کی طرف سے) ہونے کا دعویدار ہو، اسے اپنے دلائل اور منطقی استدلال کی مضبوطی کی بنیاد پر بھی قابلِ قبول ہونا چاہیے۔

مشہور ماہر طبیعیات اور نوبل انعام یافتہ سائنسدان البرٹ آئن اسٹائن کے بقول ''مذہب کے بغیر سائنس لنگڑی ہے۔ سائنس کے بغیر مذہب اندھا ہے۔'' لہٰذا اب ہم قرآن پاک کا جائزہ لیتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا جدید سائنس اور قرآن پاک میں باہمی مطابقت ہے یا عدم مطابقت؟

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ قران پاک کوئی سائنسی کتاب نہیں ہے۔ بلکہ یہ ''نشانیوں'' (Signs) کی کتاب ہے۔ یعنی آیات کی کتاب ہے۔ قرآن پاک میں چھ ہزار سے زاید ''نشانیاں'' (آیات) ہیں، جن میں ایک ہزار سے زاید خالصتاً سائنس سے (یعنی سائنسی موضوعات سے) بحث کرتی ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ کئی مواقع پر سائنس ''یوٹرن'' لیتی ہے (یعنی سابقہ مؤقف کے بالکل اُلٹ بات کہنے لگتی ہے) لہٰذا میں نے اس کتاب میں صرف اور صرف تسلیم شدہ (ثابت شدہ) سائنسی حقائق ہی کو منتخب کیا ہے جب کہ ایسے تصورات ونظریات پر بات نہیں کی ہے جو محض مفروضات ہوں یا جن کی پشت پر کوئی (سائنسی) ثبوت نہ ہو۔

فلکیات

کائنات کی تخلیق: ''بگ بینگ''

فلکی طبیعیات کے ماہرین ابتدائے کائنات کی وضاحت ایک ایسے مظہر (Phenomenon) کے ذریعے کرتے ہیں جسے وسیع طور پر قبول کیا جاتا ہے۔اور جس کا جانا پہچانا نام'' بگ بینگ''(Big Bang) ہے۔بگ بینگ کے ثبوت میں گزشتہ کئی عشروں کے دوران مشاہدات وتجربات کے ذریعے ماہرین فلکیات وفلکی طبیعیات کی جمع کردہ معلومات موجود ہیں۔ بگ بینگ نظریے کے مطابق ابتدا میں یہ ساری کائنات ایک بڑی کمیت (Primary Nebula) کی شکل میں تھی۔پھر ایک عظیم دھماکہ یعنی'' بگ بینگ'' (Secondary Separation) ہوا جس کا نتیجہ کہکشاؤں کی شکل میں ظاہر ہوا۔پھر یہ کہکشائیں تقسیم ہو کر ستاروں، سیاروں، سورج، چاند وغیرہ کی صورت میں آئیں۔کائنات کی ابتداء اس قدر منفرد اور اچھوتی تھی کہ'' اتفاق''(Chance) سے اس کے وجود میں آنے کا احتمال (Probability) صفر (کچھ بھی نہیں) تھا۔

قرآن پاک کی درج ذیل آیات میں ابتدائے کائنات کے متعلق بتایا گیا ہے:

﴿ اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا ﴾ (القرآن:سورۃ ۲۱ آیت،۳۰)

''کیا وہ لوگ جنہوں نے (نبی ﷺ کی بات ماننے سے) انکار کردیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا۔''

اس قرآنی آیت اور'' بگ بینگ'' کے درمیان حیرت انگیز مماثلت سے انکار ممکن ہی

نہیں! یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کتاب جو آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے عرب کے ریگستانوں میں ظاہر ہوئی، اپنے اندر ایسی غیر معمولی سائنسی حقیقت لیے ہوئے ہو؟

کہکشاؤں کی تخلیق سے پہلے، ابتدائی گیسی کمیت

سائنسدان اس پر متفق ہیں کہ کائنات میں کہکشائیں بننے سے بھی پہلے، کائنات کا سارا مادہ ایک ابتدائی گیسی حالت میں تھا، مختصر یہ کہ کہکشاؤں کی تشکیل سے پہلے، وسیع وعریض (گیسی) بادلوں کی شکل میں وہ مادہ موجود تھا جسے کہکشاؤں کی شکل میں آنا تھا۔ اس ابتدائی کائناتی مادے کی وضاحت میں گیس سے زیادہ موزوں لفظ ''دھواں'' ہے۔ درج ذیل آیت قرآن میں کائنات کی اسی حالت کا حوالہ ''دخان'' یعنی دھوئیں کا لفظ استعمال کر کے دیا گیا ہے۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ﴾

(القرآن: سورۃ ۴۱، آیت ۱۱)

''پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھا، اس نے آسمان اور زمین سے کہا: ''وجود میں آ جاؤ، خواہ تم چاہو، یا نہ چاہو'' دونوں نے کہا: ہم آ گئے فرماں برداروں کی طرح۔''

ایک بار پھر، یہ حقیقت بھی ''بگ بینگ'' کی عین مطابقت میں ہے جس کے بارے میں حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت سے پہلے کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔ (بگ بینگ کا نظریہ بیسویں صدی کی یعنی عہدِ نبویؐ کے ۱۳۰۰ سال بعد کی پیداوار ہے، مترجم) اگر اُس زمانے میں کوئی بھی اس سے واقف نہیں تھا تو پھر اس علم کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے؟

زمین کی کروی (گولا نما یا Spherical) ساخت

ابتدائی زمانوں کے لوگ یہ یقین رکھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدیوں تک انسان صرف اسی وجہ سے دُور دراز کا سفر کرنے سے خوفزدہ رہا کہ کہیں وہ زمین کے

کناروں سے گر نہ پڑے! سر فرانسس ڈریک وہ پہلا آدمی تھا جس نے ۱۵۹۷ء میں زمین کے گرد (سمندر کے راستے) چکر لگایا اور عملاً یہ ثابت کیا کہ زمین گول (کروی) ہے۔

یہ نکتہ ذہن میں رکھتے ہوئے ذرا درج ذیل قرآنی آیت پر غور فرمایئے جو دن اور رات کے آنے اور جانے سے متعلق ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ﴾

(القرآن: سورة ۳۱، آیت ۲۹)

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں۔''

یہاں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رات کے بتدریج دن میں ڈھلنے، اور دن کے بتدریج رات میں ڈھلنے کا تذکرہ فرمایا ہے۔ یہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب زمین کی ساخت کسی گولے جیسی یعنی کروی ہو۔ اگر زمین چپٹی ہوتی تو دن کی رات میں یا رات کی دن میں تبدیلی بالکل اچانک ہوتی۔ ذیل میں ایک اور آیت مبارک ملاحظہ ہو۔ اس میں بھی زمین کی کروی ساخت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ ﴾ (القرآن: سورة ۳۹، آیت ۵)

''اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو لپیٹتا ہے۔''

یہاں استعمال کیے گئے عربی لفظ ''کوّر'' کا مطلب ہے کسی ایک چیز کو دوسری پر منطبق (Overlap) کرنا یا (ایک چیز کو دوسری چیز پر) چکر دے کر (کوائل کی طرح) باندھنا دن اور رات کو ایک دوسرے پر منطبق کرنا یا ایک دوسرے پر چکر دینا صرف اسی وقت ممکن ہے جب زمین کی ساخت کروی ہو۔

زمین کسی گیند کی طرح بالکل ہی گول نہیں بلکہ ''ارضی کروی'' (Geo-Sperical)

ہے، یعنی قطبین (Poles) پر سے تھوڑی سی پچکی ہوئی ہے۔ درج ذیل آیت مبارک میں زمین کی ساخت کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے:

﴿ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ﴾ (القرآن: سورۃ ۷۹، آیت ۳۰)

''اور پھر زمین کو اس نے بچھایا۔''

یہاں عربی عبارت '' دَحٰهَا'' استعمال ہوئی ہے جس کا مطلب ہے'' شترمرغ کا انڈا'' شترمرغ کے انڈے کی شکل، زمین کی ارضی کروی ساخت ہی سے مشابہت رکھتی ہے۔ پس یہ ثابت ہوا کہ قرآن پاک میں زمین کی ساخت بالکل ٹھیک ٹھیک بیان کی گئی ہے، حالانکہ نزولِ قرآنِ پاک کے وقت مقبول عام تصور یہی تھا کہ زمین چپٹی ہے۔

چاند کی روشنی، منعکس شدہ روشنی ہے

قدیم تہذیبوں میں یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ چاند اپنی روشنی خود خارج کرتا ہے (یعنی از خود روشن ہے) سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ کہ چاند کی روشنی، منعکس شدہ روشنی ہے۔ تاہم یہ حقیقت آج سے چودہ سو سال پہلے، قرآن پاک کی درج ذیل آیت مبارکہ میں بیان کر دی گئی ہے:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴾ (القرآن، سورۃ ، ۲۵، آیت ۶۱)

''بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔''

قرآن پاک میں سورج کے لیے عربی لفظ ''شمس'' استعمال ہوا ہے۔ البتہ اسے (سورج کو) ''سراج'' بھی کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے مشعل (ٹارچ) جب کہ بعض مواقع پر اسے ''وہاج'' بمعنی جلتا ہوا چراغ یا جلتا ہوا دیا کے الفاظ میں بھی بیان کیا گیا ہے جس کا مفہوم ''چمکتی ہوئی شان وعظمت'' ہے مذکورہ تینوں وضاحتیں سورج کے لیے بالکل مناسب ہیں کیونکہ اس کے اندر احتراق (Combustion) کا زبردست عمل ہر وقت جاری رہنے کی وجہ سے شدید حرارت اور روشنی خارج ہوتی رہتی ہے۔

چاند کے لیے قرآن پاک میں عربی لفظ ''قمر'' استعمال کیا گیا ہے اور اسے بطور ''منیر'' بیان کیا گیا ہے ایک ایسا جسم جو ''نور'' دیتا ہو۔یعنی منعکس شدہ روشنی دیتا ہو۔ایک بار پھر، قرآن پاک کی پیش کردہ وضاحت چاند کی اصل نوعیت سے پوری طرح میل کھاتی ہے کیونکہ، بلاشبہ، چاند کی اپنی کوئی روشنی نہیں ہے بلکہ یہ سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے، اور ہمیں روشن دکھائی دیتا ہے ،قرآن پاک میں ایک مرتبہ بھی چاند کے لیے سراج ، وہاج یا دیا جیسے الفاظ استعمال نہیں ہوئے اور نہ ہی سورج کو نور یا منیر کہا گیا ہے،اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں سورج اور چاند کی روشنی کے درمیان بہت واضح فرق رکھا گیا ہے جو قرآن پاک میں آیات مبارکہ کے مطالعے سے واضح طور پر نظر آتا ہے۔

درج ذیل آیات میں سورج اور چاند کی روشنی کا فرق دیکھا جا سکتا ہے:

﴿ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا ﴾

(القرآن:سورۃ۱۰ ، آیت، ۵)

''وہی ہے جس نے سورج کو اُجالا بنایا اور چاند کو چمک دی۔''

﴿ اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۝ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴾(القرآن:سورۃ۷۱ ، آیات ۱۵ تا ۱۶)

''کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہہ بر تہہ بنائے اور ان میں چاند کو نور اور سورج کو چراغ بنایا۔''

اِن آیات مبارکہ کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن عظیم اور جدید سائنس میں دھوپ اور چاندنی کی ماہیت کے بارے میں مکمل اتفاق رائے ہے۔

سورج گھومتا ہے

ایک لمبے عرصے تک یورپی فلسفیوں اور سائنس دانوں کا یقین یہ رہا کہ زمین، کائنات مرکز میں ساکن کھڑی ہے اور سورج سمیت ، کائنات کی ہر چیز اس کے گرد چکر لگا رہی ہے یہ نظریہ جسے ارض ساکن یا ''ارض مرکزی نظریہ'' (جیوسینٹرک تھیوری) بھی کہا جاتا ہے،بطلیموس

کے زمانے (دوسری صدی قبل از مسیح) سے لے کر سولہویں صدی عیسوی تک سب سے زیادہ تسلیم کیا جانے والا ''سائنسی نظریہ'' رہا۔ پھر ۱۵۱۲ء میں نکولس کوپرنیکس نے سیاروی حرکت کا شمس مرکزی نظریہ (Heliocentric Theory of Planetary Motion) پیش کیا، جس میں یہ کہا گیا تھا کہ سورج، نظامِ شمسی کے مرکز میں ساکن ہے اور تمام سیارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ۱۶۰۹ء میں ایک جرمن سائنسدان، جوہانس کیپلر نے ''آسٹرونومیا نووا'' کے نام سے ایک کتاب شائع کروائی۔ اس کتاب میں کیپلر نے صرف یہی ثابت نہیں کیا کہ نظامِ شمسی کے سیارے بیضہ نما (Elliptical) مداروں میں سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ بلکہ اس نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ سیارے اپنے اپنے محوروں (Axes) پر غیر مستقل نوعیت کی رفتاروں سے گردش بھی کرتے ہیں۔ اس علم کی بدولت یورپی سائنسدانوں کے لیے نظامِ شمسی کے کئی ایک نظاموں کی درست وضاحت کرنی ممکن ہوگئی۔ بشمول رات اور دن کے تسلسل کے، ان دریافتوں کے بعد یہ سمجھا جانے لگا کہ سورج ساکن ہے اور زمین کی طرح اپنے محور پر گردش نہیں کرتا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے اسکول کے دنوں میں جغرافیہ کی کئی ایک کتابوں میں اسی غلط فہمی کا پرچار کیا گیا تھا۔ اب ذرا قرآن پاک کی درج ذیل آیت مبارکہ ملاحظہ فرمایئے:

﴿ وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۱، آیت ۳۳)

''اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔''

غور فرمایئے کہ مذکورہ بالا آیت میں عربی لفظ '' یَسْبَحُوْنَ '' استعمال کیا گیا ہے۔ یہ لفظ بذاتِ خود ''سبحا'' سے ماخوذ ہے، جس کے ساتھ ایک ایسی حرکت کا تصور وابستہ ہے جو کسی جسم کے متحرک ہونے سے پیدا ہوئی ہو۔ اگر آپ یہ لفظ زمین پر کسی شخص کے لیے استعمال کریں گے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ وہ لڑھک رہا ہے۔ بلکہ اس سے یہ مراد ہوگی کہ وہ شخص دوڑ رہا ہے یا چل رہا ہے۔ اگر یہ لفظ پانی میں کسی شخص کے لیے استعمال کیا جائے تو اس کا

مطلب یہ نہیں ہوگا کہ وہ (پانی پر) تیر رہا ہے بلکہ اس سے یہ مراد ہوگی کہ وہ شخص پانی میں تیراکی (Swimming) کر رہا ہے۔

اسی طرح جب آپ یہ لفظ " یُسبِّح "کسی آسمانی جسم (جرم فلکی) سورج کے لیے استعمال کریں گے تو اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہوگا کہ وہ جسم خلا میں حرکت کر رہا ہے، بلکہ اس کا پورا مطلب کوئی ایسا جسم ہوگا جو خلا میں حرکت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے محور پر بھی گھوم رہا ہے۔آج اسکولوں کی بیشتر نصابی کتابوں نے اپنی معلومات درست کرتے ہوئے یہ حقیقت شامل کر لی ہے۔کہ سورج اپنے محور پر گردش بھی کر رہا ہے۔سورج کی محوری گردش کی تصدیق کسی ایسے مشاہداتی سازوسامان کی مدد سے بہ آسانی کی جاسکتی ہے جو سورج کا عکس کسی میز جتنی بڑی جگہ پر پھیلا کر دکھا سکے،اسی طرح نابینا پن کے خطرے سے دوچار ہوئے بغیر سورج کے عکس کا مشاہدہ کیا جا سکے گا۔یہ دیکھا گیا ہے کہ سورج کی سطح پر دھبے ہیں جو اپنا ایک چکر تقریباً پچیس دن میں مکمل کر لیتے ہیں۔مطلب یہ کہ سورج کو اپنے محور کے گرد ایک چکر پورا کرنے میں تقریباً پچیس دن لگ جاتے ہیں۔علاوہ ازیں سورج تقریباً ۲۴۰ کلومیٹر فی سیکنڈ (جی ہاں! ۲۴۰ کلومیٹر فی سیکنڈ) کی رفتار سے (اپنے سیاروں سمیت) خلا میں سفر کر رہا ہے۔ اس رفتار سے یہ تقریباً بیس کروڑ سال میں ہماری ملکی وے کہکشاں کے مرکز کے گرد اپنا ایک چکر مکمل کرتا ہے۔

﴿ لاَ الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلاَ الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ ﴾ (القرآن: سورة ۳٦ ، آیت ۴۰)

"نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جاسکتی ہے یہ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔"

یہ آیت مبارکہ ایک ایسی بنیادی اور اہم حقیقت کی جانب اشارہ کرتی ہے جسے جدید فلکیات نے قدرے حال ہی میں دریافت کیا ہے،یعنی چاند اور سورج کے انفرادی مداروں (Orbits) کی موجودگی اور حرکت کرتے ہوئے خلا میں ان کا سفر کرنا۔

وہ ''ساکن جگہ'' (Fixed Place) جس کی سمت ہمارا سورج اپنے تمام تر نظام (نظام شمسی) سمیت عازم سفر ہے۔ جدید فلکیات کی بدولت ٹھیک ٹھیک شناخت کر لی گئی ہے۔ اسے ''سولر ایپکس'' کا نام دیا گیا ہے پورا نظام شمسی درحقیقت خلا میں اس مقام کی سمت حرکت کر رہا ہے۔ جو ہرکولیس نامی برج (ایلفا لیرائی) میں واقع ہے اور جس کی درست جگہ آج ہمیں معلوم ہو چکی ہے۔

چاند اپنے محور پر اتنی ہی مدت میں گردش پوری کرتا ہے کہ جتنی دیر میں وہ زمین کے گرد ایک چکر پورا کرتا ہے۔ چاند کو اپنی ایک محوری گردش پوری کرنے میں تقریباً ۲۹ء۵ دن لگ جاتے ہیں۔ قرآن پاک کی آیات مبارکہ میں سائنسی حقائق کی درستگی پر حیران ہوئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہتا۔ کیا ہمارے ذہنوں میں یہ سوال مچل نہیں اُٹھتا ''قرآن میں پیش کیے گئے علم کا ماخذ، علم کا منبع آخر کیا ہے؟''

سورج بجھ جائے گا

سورج کی روشنی ایک کیمیائی عمل کی مرہون منت ہے جو اس کی سطح پر گذشتہ پانچ ارب سال سے جاری ہے۔ مستقبل میں کسی موقع پر یہ عمل رک جائے گا، اور تب سورج مکمل طور پر بجھ جائے گا جس کی وجہ سے زمین پر زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔ سورج کے وجود کی بے ثباتی کے بارے میں قرآن پاک فرماتا ہے:

﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِىْ لِمُسْتَقَرٍّ لَهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۶، آیت ۳۸)

''اور سورج، وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے، یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔''

(نوٹ: کم وبیش اسی نوعیت کی باتیں قرآن پاک کی سورۃ ۱۳، آیت ۲؛ سورۃ ۳۵ آیت ۱۳؛ سورۃ ۳۹، آیت ۵؛ اور سورۃ ۳۹، آیت ۲۱ میں بھی بیان کی گئی ہیں۔) یہاں عربی لفظ ''مستقر'' استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے پہلے سے متعین کیا ہوا وقت یا جگہ یعنی اس آیت

مبارکہ میں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ سورج پہلے سے طے شدہ ایک مقام کی طرف جا رہا ہے، اور یہ کہ وہ ایسا پہلے سے طے شدہ وقت کے مطابق ہی کرے گا۔ مطلب یہ کہ سورج بھی ختم ہو جائے گا، یا بجھ جائے گا۔

بین النجمی مادہ

پچھلے زمانوں میں منظّم فلکیاتی نظاموں سے باہر کی خلا (بیرونی خلا) کو مکمل طور پر "خالی خلا" (Vacum) تصور کیا جاتا تھا بعدازاں ماہرین فلکی طبیعیات نے اسی خالی خلا یعنی بین النجمی خلا میں مادے کے پل (Bridges) دریافت کیے، مادے کے ان "پلوں" کو پلازما (Plasma) کہا جاتا ہے جو مکمل طور پر آئن شدہ (Ionized) گیس پر مشتمل ہوتے ہیں جس میں مثبت چارج والے آئن اور آزاد الیکٹرونوں کی مساوی تعداد ہوتی ہے۔ مادے کی تین جانی پہچانی حالتوں، یعنی ٹھوس، مائع اور گیس کو چھوڑ کر پلازما کو بسا اوقات مادے کی "چوتھی حالت" بھی کہا جاتا ہے۔ درج ذیل آیات مبارکہ میں قرآنِ پاک بین النجمی مادے (انٹر اسٹیلر میٹریل) کی جانب اشارہ کرتا ہے:

﴿ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ﴾

(القرآن، سورۃ ۲۵، آیت ۵۹)

"وہ جس نے چھ دنوں میں زمین اور آسمان اور ان ساری چیزوں کو بنا کر رکھ دیا جو آسمان وزمین کے درمیان ہیں۔"

کسی کے لیے بطور قیاس بھی یہ کہنا مضحکہ خیز ہوگا کہ بین النجمی کہکشانی مادّے کی موجودگی آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے ہمارے علم میں تھی۔

پھیلتی ہوئی کائنات

۱۹۲۵ء میں امریکی ماہر فلکیات ایڈون ہبل نے اس امر کا مشاہداتی ثبوت فراہم کیا کہ تمام کہکشائیں ایک دوسرے سے دور ہٹ رہی ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات پھیل رہی ہے۔ کائنات پھیل رہی ہے یہ بات آج مسلمہ سائنسی حقائق میں شامل ہے ملاحظہ فرمایے کہ

قرآنِ پاک میں کائنات کی ماہیت کے حوالے سے کیا ارشاد ہوا ہے:

﴿ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴾

(القرآن: سورۃ ۵۱، آیت ۴۷)

''آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں (یا اسے وسعت دے رہے ہیں)''

عربی لفظ ''واسعون'' کا صحیح ترجمہ ''اسے پھیلا رہے ہیں'' بنتا ہے اور یہ ایک ایسی کائنات کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی وسعتیں مسلسل پھیلتی جارہی ہوں۔

عصرِ حاضر کا مشہور ترین فلکی طبیعیات داں اسٹیفن ہاکنگ اپنی تصنیف ''اے بریف ہسٹری آف ٹائم'' میں لکھتا ہے: ''یہ دریافت کہ کائنات پھیل رہی ہے، بیسویں صدی کے عظیم علمی وفکری انقلابات میں سے ایک ہے'' غور فرمایئے کہ قرآن پاک نے کائنات کے پھیلنے کو اس وقت بیان فرمادیا ہے جب انسان نے دوربین تک ایجاد نہیں کی تھی اس کے باوجود، متشکک ذہن رکھنے والے بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں فلکیاتی حقائق کا موجود ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہیں، کیونکہ عرب اس علم میں بہت ماہر تھے۔ فلکیات میں عربوں کی مہارت کی حد تک تو اُن کا خیال درست ہے لیکن اس نکتے کا ادراک کرنے میں وہ ناکام ہو چکے ہیں کہ فلکیات میں عربوں کے عروج سے بھی صدیوں پہلے ہی قرانِ پاک کا نزول ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں، اوپر بیان کردہ بہت سے سائنسی حقائق، مثلاً بگ بینگ، سے کائنات کی ابتدا وغیرہ سے تو عرب اُس وقت بھی واقف نہیں تھے جب وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے عروج پر تھے۔ لہٰذا قرآنِ پاک میں بیان کردہ سائنسی حقائق کسی بھی طرح سے فلکیات میں عربوں کی مہارت کا نتیجہ قرار نہیں دیے جا سکتے۔ درحقیقت اس کے برعکس بات سچ ہے، عربوں نے فلکیات میں اس لیے ترقی کی کیونکہ فلکیاتی وکونیاتی مباحث کو قرآنِ پاک میں اہم مقام دیا گیا ہے۔

طبیعیات

ایٹم بھی تقسیم کیے جاسکتے ہیں:

قدیم زمانوں میں ''ایٹم ازم (Atomism) کا نظریہ'' کے عنوان سے ایک مشہور نظریے کو وسیع پیمانے پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ نظریہ یونانیوں نے بالخصوص دیموقریطس نامی ایک یونانی فلسفی نے پیش کیا تھا، جو آج سے ۲۳ صدیاں پہلے (۲۳۰۰ سال پہلے) گزرا ہے۔ دیموقریطس اور بعدازاں اس کے ہم خیال لوگوں کا یہ تصور تھا کہ مادے کا مختصر ترین یونٹ (اکائی) ایٹم ہے۔ قدیم عرب بھی اسی تصور کو تسلیم کیا کرتے تھے۔ عربی لفظ'' ذرّہ'' کا عمومی مفہوم وہی ہوا کرتا تھا جو یونانیوں کے یہاں ایٹم کا تھا۔ حالیہ تاریخ ہی میں سائنس نے دریافت کیا ہے کہ ایٹم تک کو تقسیم کرنا (شق کرنا) ممکن ہے۔ ایٹم کے قابلِ تقسیم ہونے کا تصور بھی بیسویں صدی کی سائنسی پیش رفت میں شامل ہے۔ چودہ صدیاں پہلے خود عربوں کے لیے بھی یہ تصور نہایت غیر معمولی ہوتا۔ ان کے نزدیک ''ذرّہ'' وہ حد تھی جس سے آگے مزید تقسیم ممکن ہی نہیں تھی۔ لیکن درج ذیل آیت مبارکہ میں قرآنِ پاک نے واضح طور پر اس حد کو ماننے سے انکار کیا ہے:

﴿ وَ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ وَ لَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرُ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴾

(القرآن: سورۃ ۳۴، آیت ۳)

''منکرین کہتے ہیں کیا بات ہے کہ قیامت ہم پر نہیں آ رہی ہے، کہو قسم ہے میرے عالم الغیب پروردگار کی، وہ تم پر آ کر رہے گی۔ اس سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ

آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے نہ زمین میں۔ نہ ذرے سے بڑی اور نہ اس سے چھوٹی۔ یہ سب کچھ ایک نمایاں دفتر میں درج ہے۔''

(نوٹ: اسی طرح کا پیغام قرآن پاک کی سورۃ ۱۰، آیت ۶۱ میں بھی دیا گیا ہے۔)

یہ آیتِ مبارکہ ہمیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے عالم الغیب ہونے، یعنی ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز سے باخبر ہونے کے بارے میں بتاتی ہے۔ پھر یہ مزید آگے بڑھتی ہے اور کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے باخبر ہے، چاہے وہ ایٹم سے چھوٹی یا بڑی ہی کیوں نہ ہو۔ تو ثابت ہوا کہ یہ آیتِ مبارکہ واضح طور پر بتاتی ہے کہ ایٹم سے مختصر اشیا بھی وجود رکھتی ہے...... اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو حال ہی میں جدید سائنس نے دریافت کی ہے۔

آبیات

پانی کا چکر (آبی چکر)

آج ہم جس تصور کو ''آبی چکر'' (واٹر سائیکل) کے نام سے جانتے ہیں، اسے پہلے پہل ۱۵۸۰ء میں برنارڈ پیلیسی نامی ایک شخص نے پیش کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ سمندروں سے کس طرح پانی کی تبخیر (Evaporation) ہوتی ہے اور کس طرح وہ سرد ہو کر بادلوں کی شکل میں آتا ہے۔ پھر یہ بادل خشکی پر آگے کی طرف بڑھتے ہیں، بلند تر ہوتے ہیں، ان میں پانی کی تکثیف (Condensation) ہوتی ہے اور بارش برستی ہے۔ یہ پانی جھیلوں، جھرنوں، ندیوں اور دریاؤں کی شکل [illegible] نا ہے اور بہتا ہوا واپس سمندر میں چلا جاتا ہے اس طرح پانی کا یہ چکر جاری رہتا ہے۔ ساتویں صدی قبل از مسیح میں تھیلز نامی ایک یونانی فلسفی کو یقین تھا کہ سطح سمندر پر باریک باریک آبی قطروں کی پھوار (اسپرے) پیدا ہوتی ہے نیز ہوا اسی پھوار کو اُٹھا لیتی ہے اور خشکی کے دور افتادہ علاقوں پر لے جا کر برسا دیتی ہے۔ یہی بارش ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں، پرانے وقتوں میں لوگ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ زیرِ زمین پانی کا ماخذ کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہوا کی زبردست قوت کے زیرِ اثر سمندر کا پانی براعظموں (خشکی) میں اندرونی حصوں تک در آتا ہے۔ انہیں یہ یقین بھی تھا کہ پانی ایک خفیہ راستے یا ''عظیم تاریکی'' (Greet Abyss) سے آتا ہے، سمندر سے ملا ہوا یہ تصوراتی راستہ افلاطون کے زمانے سے ''ٹارٹارس'' کہلاتا تھا، حتیٰ کہ اٹھارہویں صدی کے عظیم مفکر، ڈیکارتے (Descartes) نے بھی انہی خیالات سے اتفاق کیا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی تک ارسطو کا نظریہ ہی زیادہ مقبول و معروف رہا۔ اس نظریے کے مطابق، پہاڑوں کے سرد غاروں میں پانی کی تکثیف (Condensation) ہوتی ہے اور وہ

زیرِ زمین جھیلیں بناتا ہے جو چشموں کا باعث بنتی ہیں۔ آج ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ بارش کا پانی زمین پر موجود دراڑوں کے راستے رِس رِس کر زیرِ زمین پہنچتا ہے اور چشموں کی وجہ بنتا ہے، درج ذیل آیاتِ قرآنی میں اس نکتے کی وضاحت فرمائی گئی ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳۹، آیت ۲۱)

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا، پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں۔''

﴿ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيِ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳۰، آیت ۲۴)

''آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعے سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۳، آیت ۱۸)

''اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اُتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا، ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔''

کوئی دوسری کتاب، جو ۱۴۰۰ سال قدیم ہو، آبی چکر کی اتنی درست وضاحت بیان نہیں کرتی۔

تبخیر (Evaporation)

﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ﴾ (القرآن: سورۃ ۸۶، آیت ۱۱)

''قسم ہے بارش برسانے والے آسمان کی۔''

بادلوں کو بارآور (Impregnate) کرتی ہوائیں

﴿ وَ اَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ﴾

(القرآن: سورۃ ۱۵، آیت ۲۲)

''اور ہم ہی ہواؤں کو بارآور بنا کر چلاتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے اور تم کو اس سے سیراب کرتے ہیں۔''

یہاں عربی لفظ ''لواقح'' استعمال کیا گیا ہے، جو ''لاقح'' کی جمع ہے اور ''لاقحہ'' سے مشتق ہے، جس کا مطلب ''بارآور'' کرنا یا ''بھر دینا'' ہے، اسی سیاق وسباق میں، بارآور سے مراد یہ ہے کہ ہوا، بادلوں کو (ایک دوسرے کے) قریب دھکیلتی ہے جس کی وجہ سے ان پر تکثیف کا عمل بڑھتا ہے جس کا نتیجہ بجلی چمکنے اور بارش ہونے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی توضیحات، قرآنِ پاک کی دیگر آیات مبارکہ میں بھی موجود ہیں:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۴، آیت ۴۳)

''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے اور پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں اور وہ آسمان سے ان پہاڑوں کی بدولت جو اس میں بلند ہیں اولے برساتا ہے پھر جسے چاہتا ہے ان کا نقصان پہنچاتا ہے اور جسے چاہتا ہے ان سے بچا لیتا ہے اس کی بجلی کی چمک نگاہوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔''

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَ يَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ

مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ (القرآن: سورة ۳۰، آیت ۴۸)

''اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اُٹھاتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے، جس طرح چاہتا ہے اور انہیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش وخرم ہو جاتے ہیں۔''

آبیات (ہائیڈ ورلوجی) پر دستیاب، جدید معلومات بھی قرآنِ پاک میں بیان کردہ متعلقہ وضاحتوں کی پوری طرح تائید کرتی ہیں۔ قرآنِ عظیم کی متعدد آیات مبارکہ میں آبی چکر کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔

مثلاً ملاحظہ ہوں: سورۃ ۷، آیت، ۵۷؛ سورۃ ۱۳، آیت ۱۷؛ سورۃ ۲۵، آیات ۴۸ تا ۴۹؛ سورۃ ۳۵، آیت ۹؛ سورۃ، ۳۰، آیت ۲۴؛ سورۃ ۴۵، آیت ۵؛ سورۃ ۵۰، آیات ۹ تا ۱۱؛ سورۃ ۵۶، آیات ۶۸ تا ۷۰؛ اور سورۃ ۶۷، آیت ۳۰.

ارضیات

خیموں کی میخوں کی مانند پہاڑ:

ارضیات میں ''بل پڑنے'' (Folding) کا مظہر حالیہ دریافت شدہ حقیقت ہے۔ قشرِ ارض (Crust) میں بل پڑنے ہی کی وجہ سے پہاڑی سلسلے وجود میں آئے ہیں۔ قشرِ ارض، جس پر ہم رہتے ہیں، کسی ٹھوس چھلکے کی طرح ہے، جب کہ کرہ زمین کی اندرونی پرتیں، (Layers) نہایت گرم اور مائع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زمین کا اندرون کسی بھی قسم کی زندگی کے لیے قطعاً غیر موزوں ہے۔ آج ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ پہاڑوں کی قیام پذیری (Stability) کا تعلق، قشرِ ارض میں بل پڑنے کے عمل سے بہت گہرا ہے، کیونکہ یہ قشرِ ارض پر پڑنے والے بل (Folds) ہی ہیں جو پہاڑوں کا کام کرتے ہیں۔

ماہرین ارضیات کا کہنا ہے کہ زمین کا رداس (Radius) یعنی نصف قطر تقریباً ۶،۰۳۵ کلومیٹر ہے اور قشرِ ارض، جس پر ہم رہتے ہیں، اس کے مقابلے میں بہتر پتلی ہے، جس کی موٹائی ۲ کلومیٹر سے لے کر ۳۵ کلومیٹر تک ہے۔ چونکہ قشرِ ارض بہت پتلی ہے، لہٰذا اس کے تھرتھرانے یا ہلنے کا امکان بھی بہت قوی ہے، ایسے میں پہاڑ کسی خیمے کی میخوں کی طرح کام کرتے ہیں جو قشرِ ارض کو تھام لیتے ہیں اور اسے قیام پذیری عطا کرتے ہیں۔ قرآنِ پاک میں بھی عین یہی کہا گیا ہے:

﴿ اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ مِهٰدًا ۝ وَّالۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ﴾

(القرآن: سورۃ ۷۸، آیات ۶ تا ۷)

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔''

یہاں عربی لفظ ''اوتاد'' کا مطلب بھی میخیں ہی نکلتا ہے، ویسی ہی میخیں جیسی کہ خیمے کو باندھے رکھنے کے لیے لگائی جاتی ہیں۔ ارضیاتی بلوں، (Folds) یا سلوٹوں کی گہری پوشیدہ بنیادیں بھی یہی ہیں۔

Earth نام کی ایک کتاب ہے جو دنیا بھر کی کئی جامعات میں ارضیات کی بنیادی حوالہ جاتی نصابی کتاب کا درجہ بھی رکھتی ہے، اس کتاب کے مصنفین میں ایک نام ڈاکٹر فرینک پریس کا بھی ہے، جو ۱۲ سال تک امریکہ کی اکیڈمی آف سائنسز کے سربراہ رہے ہیں جبکہ سابق امریکی صدر جمی کارٹر کے زمانے میں صدارتی مشیر برائے سائنس بھی تھے اس کتاب میں وہ پہاڑوں کی وضاحت، کلہاڑی کے پھل جیسی شکل (Wedge Shape) سے کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ پہاڑ بذاتِ خود ایک وسیع تر وجود کا ایک چھوٹا حصہ ہوتا ہے۔ جس کی جڑیں زمین میں بہت گہرائی تک اُتری ہوتی ہیں۔

(ملاحظہ ہو: Earth از: پریس اور سلور، صفحہ ۴۳۵ مزید دیکھیے: Earth Science از: ٹاربک اور لٹکنز، صفحہ ۱۵۷)

ڈاکٹر فرینک پریس کے مطابق، قشرِ ارض کی پائیداری اور قیام پذیری میں پہاڑ نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

پہاڑوں کے کاموں کی وضاحت کرتے ہوئے، قرآن پاک واضح طور پر یہ فرماتا ہے کہ انہیں اس لیے بنایا گیا ہے تاکہ یہ زمین کو لرزتے رہنے سے بچائیں:

﴿ وَ جَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِهِمْ ﴾

(القرآن: سورة ۲۱، آیت ۳۱)

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔''

اسی طرح کے ارشادات سورۃ ۳۱، آیت ۱۰؛ اور سورۃ ۱۶، آیت ۱۵ میں بھی وارد ہوئے ہیں، لہٰذا قرآنِ پاک کے فراہم کردہ بیانات جدید ارضیاتی معلومات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔

پہاڑوں کو مضبوطی سے جما دیا گیا ہے

سطح زمین متعدد ٹھوس ٹکڑوں، یعنی ''پلیٹوں'' میں ٹوٹی ہوئی ہے جن کی اوسط موٹائی تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر ہے۔ یہ پلیٹیں، جزوی طور پر پگھلے ہوئے حصے کے اوپر گویا تیر رہی ہیں، اس حصے کو (Aesthenosphere) کہا جاتا ہے۔ پہاڑ عموماً پلیٹوں کی بیرونی حدود پر پائے جاتے ہیں۔ قشرِ ارض، سمندروں کے نیچے ۵ کلومیٹر موٹی ہوتی ہے، جب کہ خشکی پر اس کی اوسط موٹائی ۳۵ کلومیٹر تک ہوتی ہے البتہ پہاڑی سلسلوں میں قشرِ ارض کی موٹائی ۸۰ کلومیٹر تک جا پہنچتی ہے، یہی وہ مضبوط بنیادیں ہیں جن پر پہاڑ کھڑے ہیں۔ پہاڑوں کی مضبوط بنیادوں کے بارے میں قرآنِ پاک نے درج ذیل آیت مبارکہ میں کچھ یوں بیان فرمایا ہے:

﴿ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ﴾ (القرآن: سورۃ ۷۹، آیت ۳۲)

''اور پہاڑ اس میں گاڑ دیے۔''

اسی طرح کا پیغام سورۃ ۸۸، آیت ۱۹ میں بھی دیا گیا ہے۔ پس، یہ ثابت ہوا کہ قرآن پاک میں پہاڑوں کی ماہیت اور نوعیت کے بارے میں دی گئی معلومات بھی پوری طرح دورِ جدید کی ارضیاتی دریافتوں سے ہم آہنگ ہیں۔

بحریات

میٹھے اور نمکین پانیوں کے درمیان ''آڑ''

﴿ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیَانِ ۝ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیَانِ ﴾

(القرآن: سورة ۵۵ آیت ۱۹ تا ۲۰)

''دوسمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں، پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔''

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان آیات مبارکہ کے عربی متن میں لفظ ''برزخ'' استعمال ہوا جس کا مطلب رکاوٹ یا آڑ (پارٹیشن) ہے۔ تاہم اسی تسلسل میں ایک اور عربی لفظ ''مرج'' بھی وارد ہوا ہے۔ جس کا مطلب ''وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتے اور آپس میں ہم آمیز ہوتے ہیں'' بنتا ہے۔ ابتدائی ادوار کے مفسرین قرآن کے لیے یہ وضاحت کرنا بہت مشکل تھا کہ پانی کے دو مختلف اجسام سے متعلق دو متضاد مفاہیم سے کیا مراد ہے۔ مطلب یہ کہ دو طرح کے پانی ہیں جو آپس میں ملتے بھی ہیں اور ان کے درمیان آڑ (رکاوٹ) بھی ہے۔ جدید سائنس نے دریافت کیا ہے کہ جہاں جہاں دو مختلف بحیرے (Seas) آپس میں ملتے ہیں، وہاں وہاں ان کے درمیان ''آڑ'' بھی ہوتی ہے۔ دو بحیروں کو تقسیم کرنے والی رکاوٹ یہ ہے کہ ان میں سے ایک بحیرہ کا درجہ حرارت، شوریدگی (Salinity) اور کثافت دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

(بحوالہ: پرنسپلز آف اوشنوگرافی، ڈیوس، صفحہ ۹۲ تا ۹۳)

آج ماہرین بحریات مذکورہ آیات مبارکہ کی بہتر وضاحت کر سکتے ہیں۔ دو بحیروں کے درمیان پانی ہی کی ایک نازک اور غیر مرئی رکاوٹ (طبعی قوتوں کی وجہ سے) قائم ہوتی ہے جس سے گزر کر ایک بحیرے کا پانی دوسرے میں شامل ہوتا ہے۔ لیکن جب ایک بحیرے کا پانی،

دوسرے بحیرے میں داخل ہوتا ہے تو وہ اپنی امتیازی خصوصیات کھو دیتا ہے اور دوسرے کے پانی کے ساتھ ہم جنس آمیزہ (Homogeous Mixture) بنا لیتا ہے، گویا ایک طرح سے یہ رکاوٹ کسی عبوری ہم آمیزی والے علاقے کا کام کرتی ہے، جو دونوں بحیروں کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ یہ مظہر درج ذیل آیتِ قرآنی میں بھی بیان کیا گیا ہے:

﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّ جَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّ جَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَ جَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (القرآن، سورۃ ۲۷، آیت ۶۱)

"اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں (پہاڑوں کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان پردے حائل کر دیے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی (ان کاموں میں شریک) ہے؟ نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان ہیں۔"

یہ مظہر متعدد مقامات پر وقوع پذیر ہوتا ہے جن میں جبل الطارق (جبرالٹر) کے علاقے میں بحیرۂ روم اور بحیر اوقیانوس کے ملنے کا مقام نمایاں طور پر قابل ذکر ہے اسی طرح کیپ پوائنٹ اور کیپ پینسولا (Cape Peninsula) جنوبی افریقہ میں بھی (پانی کے بیچ) ایک سفید پٹی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہیں جہاں بحرِ اوقیانوس اور بحرِ ہند کا ایک دوسرے سے ملاپ ہوتا ہے۔

لیکن جب قرآن پاک تازہ اور کھارے پانی کے درمیان رکاوٹ (آڑ) کا تذکرہ کرتا ہے تو اس آڑ کے ساتھ ایک "ممنوعہ علاقے" کے بارے میں بھی بتاتا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴾

(القرآن، سورۃ ۲۵، آیت ۵۳)

"اور وہی جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے، ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور

اور ان دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے ایک رکاوٹ ہے جو انہیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

جدید سائنس نے دریافت کیا ہے کہ ساحل کے نزدیکی (سمندری) مقامات پر جہاں (دریا کا) تازہ (میٹھا) اور (سمندر کا) نمکین پانی آپس میں ملتے ہیں وہاں کی کیفیت اُن مقامات سے قدرے مختلف ہوتی ہے جہاں دو سمندروں کے نمکین پانی آپس میں ملتے ہیں یہ دریافت ہوا ہے کہ کھاڑیوں (Estuaries) میں تازہ پانی کو کھاری پانی سے جو چیز جدا کرتی ہے وہ۔ ''پکنوکلائن زون'' (Pycnocline Zone) ہے جس کی کثافت غیر مسلسل ہوتی (گھٹتی بڑھتی رہتی) ہے جو (کھاری اور تازہ پانی کی) مختلف پرتوں (Layers) کو ایک دوسرے سے الگ رکھتی ہے۔ (بحوالہ: اوشنوگرافی، ازگروس صفحہ ۲۴۲ مزید دیکھئے: انٹروڈکٹری اوشنوگرافی، ازتھرمین صفحہ ۳۰۰ تا ۳۰۱) اس رکاوٹ (یعنی علاقۂ امتیاز) کے پانی میں نمک کا تناسب (شوریت) تازہ پانی اور کھاری پانی، دونوں ہی سے مختلف ہوتا ہے۔ (بحوالہ: اوشنوگرافی، صفحہ ۲۴۴ انٹروڈکٹری اوشنوگرافی، صفحہ ۳۰۰ تا ۳۰۱) اس مظہر کا مشاہدہ بھی متعدد مقامات پر کیا گیا ہے جن میں مصر بطور خاص قابلِ ذکر ہے کہ جہاں دریائے نیل، بحرۂ روم میں گرتا ہے۔

قرآن پاک میں بیان کیے گئے ان سائنسی مظاہر کی تصدیق ''ڈاکٹر ولیم ہے'' نے بھی کی ہے جو کولوراڈو یونیورسٹی امریکہ کے مشہور ماہر بحریات اور علومِ ارضی کے پروفیسر ہیں۔

سمندر کی گہرائیوں میں اندھیرا

پروفیسر درگا راؤ دنیا کے جانے پہچانے ماہر بحری ارضیات ہیں اور وہ شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ (سعودی عرب) میں پروفیسر بھی رہ چکے ہیں۔ ان سے درج ذیل آیت مبارکہ پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا گیا:

﴿ اَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰهَا وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۴ آیت ۴۰)

''یا پھر اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک گہرے سمندر میں اندھیرا کہ اوپر ایک موج چھائی ہوئی ہے، اس کے اوپر ایک اور موج اور اس کے اوپر بادل، تاریکی پر تاریکی مسلط ہے۔ آدمی اپنا ہاتھ نکالے تو اسے بھی نہ دیکھنے پائے۔ اللہ جسے نور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔''

پروفیسر راؤ نے کہا کہ سائنس دان صرف حال ہی میں جدید آلات کی مدد سے یہ تصدیق کرنے کے قابل ہوئے ہیں کہ سمندر کی گہرائیوں میں تاریکی ہوتی ہے۔ یہ انسان کے بس سے باہر ہے کہ وہ ۲۰ یا ۳۰ میٹر سے زیادہ گہرائی میں اضافی ساز و سامان اور آلات سے لیس ہوئے بغیر غوطہ لگا سکے۔ علاوہ ازیں، انسانی جسم میں اتنی قوت برداشت نہیں کہ جو ۲۰۰ میٹر سے زیادہ گہرائی میں پڑنے والے آبی دباؤ کا سامنا کرتے ہوئے زندہ بھی رہ سکے۔ یہ آیتِ مبارک تمام سمندروں کی طرف اشارہ نہیں کرتی کیونکہ ہر سمندر کو پرت در پرت تاریکی کا حامل قرار نہیں دیا جا سکتا، البتہ یہ آیتِ مبارک بطور خاص گہرے سمندروں کی جانب متوجہ کرتی ہے کیونکہ قرآن پاک کی اس آیت میں بھی ''وسیع اور گہرے سمندر کی تاریکی'' کا حوالہ دیا گیا ہے، گہرے سمندر کی یہ تہہ در تہہ تاریکی دو اسباب کا نتیجہ ہے۔

اوّل: عام روشنی کی ایک شعاع سات رنگوں سے مل کر بنتی ہے۔ یہ سات رنگ بالترتیب بنفشی، کاسنی، نیلا، سبز، پیلا، نارنجی، سرخ (Vibgyor) ہیں۔ روشنی کی شعاع جب پانی میں داخل ہوتی ہے تو انعطاف (ریفریکشن) کے عمل سے گزرتی ہے اوپر کے دس سے پندرہ میٹر کے دوران پانی میں سرخ رنگ جذب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی غوطہ خور پانی میں پچیس میٹر کی گہرائی تک جا پہنچے اور زخمی ہو جائے تو وہ اپنے خون میں سرخی نہیں دیکھ پائے گا کیونکہ سرخ رنگ کی روشنی اتنی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتی۔ اسی طرح ۳۰ سے ۵۰ میٹر تک کی گہرائی آتے آتے نارنجی (اورنج) روشنی بھی مکمل طور پر جذب ہو جاتی ہے پیلی روشنی ۵۰ سے ۱۱۰ میٹر تک، سبز روشنی ۱۰۰ سے ۲۰۰ میٹر تک، نیلی روشنی ۲۰۰ میٹر سے کچھ زیادہ تک جب کہ کاسنی اور بنفشی روشنی اس سے بھی کچھ زیادہ گہرائی تک پہنچتے پہنچتے مکمل طور پر جذب ہو جاتی ہیں، پانی میں رنگوں کے

اس طرح ترتیب وار غائب ہونے کی وجہ سے سمندر بھی تہہ در تہہ کر کے تاریک ہوتا چلا جاتا ہے، یعنی اندھیرے کا ظہور بھی روشنی کی پرتوں (Layers) کی شکل میں ہوتا ہے۔ ۱۰۰۰ میٹر سے زیادہ کی گہرائی میں مکمل اندھیرا ہوتا ہے۔ (بحوالہ: اوشنز از: ایلڈر اور پرنیٹا صفحہ ۲۷)

دوم: دھوپ کی شعاعیں بادلوں میں جذب ہوتی ہیں۔ جو نتیجتاً روشنی کی شعاعوں کو ادھر اُدھر بکھیرتے ہیں، جس کی وجہ سے بادلوں کے نیچے تاریکی کی ایک پرت (تہہ) سی بن جاتی ہے۔ یہ تاریکی کی پہلی پرت ہے جب روشنی کی شعاعیں سطح سمندر سے ٹکراتی ہیں تو وہ (سمندری) لہروں کی سطح سے ٹکرا کر پلٹتی ہیں اور جگمگانے کا سا تاثر دیتی ہیں، للہذا یہ (سمندری) لہریں ہیں جو روشنی کو منعکس کرتی ہیں تاریکی کی وجہ بنتی ہیں۔ غیر منعکس شدہ روشنی، سمندر کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتی ہے، للہذا سمندر کے دو حصے ہوئے، سطح کی امتیازی علامت روشنی اور گرمی ہیں، جب کہ اندھیرا سمندری گہرائیوں کا طرۂ امتیاز ہے، علاوہ ازیں گہرے سمندر اور سطح سمندر کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے والی چیز بھی لہریں ہی ہیں۔

اندرونی موجیں سمندروں کے گہرے پانیوں کا احاطہ کرتی ہیں کیونکہ گہرے پانیوں کی کثافت اپنے اوپر موجود (کم گہرائی والے) پانیوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ اندرونی پانیوں ہی میں تاریکی کا راج ہوتا ہے۔ سمندر کی اتنی گہرائی میں مچھلیاں بھی دیکھ نہیں سکتیں؛ روشنی کا واحد ذریعہ خود ان کے جسم ہوتے ہیں۔

اسی بات کو قرآن پاک نہایت جامع انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

"مثل ان اندھیروں کے ہے جو نہایت گہرے سمندر کی تہہ میں ہوں جسے اوپر تلے کی موجوں نے ڈھانپ رکھا ہو۔"

بالفاظ دیگر، ان لہروں کے اوپر مزید اقسام کی لہریں ہیں، یعنی وہ لہریں جو سمندر کی سطح پر پائی جائیں۔ اسی تسلسل میں یہ آیت مبارکہ فرماتی ہے۔ "پھر اوپر سے بادل چھائے ہوئے ہوں۔ غرض اندھیریاں ہیں جو اوپر تلے پے در پے ہیں۔ جیسا کہ وضاحت کی گئی، یہ بادل وہ پے در پے رکاوٹیں ہیں جو مختلف سطحوں پر روشنی کے مختلف رنگ جذب کرتے ہوئے اندھیرے

کو بڑھاوا دیتی چلی جاتی ہیں۔

پروفیسر درگاراؤ نے یہ کہتے ہوئے اپنی بات مکمل کی ''۱۴۰۰ سال پہلے کوئی عام انسان اس مظہر کو اتنی تفصیل سے بیان نہیں کر سکتا تھا، لہٰذا یہ معلومات یقیناً کسی مافوق الفطرت ذریعے سے آئی ہیں۔''

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴾ (القرآن، سورة ۲۵، آیت ۵۴)

''اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلے چلائے۔ تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے۔''

کیا یہ ممکن تھا کہ چودہ صدیوں پہلے کوئی بھی انسان یہ اندازہ لگا سکے کہ ہر ایک جاندار چیز پانی ہی سے وجود میں آئی ہے؟ مزید برآں کیا یہ ممکن تھا کہ عرب کے ریگزاروں سے تعلق رکھنے والا کوئی فرد ایسا کوئی اندازہ قائم کر لیتا؟ ایسے ریگزاروں کا باشندہ کہ جہاں پانی کی قلت ہمیشہ رہتی ہو۔

نباتیات (Botany)

پودوں میں نر اور مادہ

پرانے زمانے کے انسان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ پودوں میں بھی جانوروں کی طرح نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ البتہ جدید نباتیات یہ بتاتی ہے کہ ہر پودے کی نر اور مادہ صنف ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ پودے جو یک صنفی (Unisexual) ہوتے ہیں۔ ان میں بھی نر اور مادہ کے امتیازی اجزاء یکجا ہوتے ہیں۔

﴿ وَّ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖۤ اَزۡوَاجًا مِّنۡ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴾

(القرآن، سورۃ ۲۰، آیت ۵۳)

"اور اوپر سے پانی برسایا اور پھر اس کے ذریعہ سے مختلف اقسام کی پیداوار (جوڑا جوڑا) نکالی۔"

پھلوں میں نر اور مادہ کا فرق

﴿ وَ مِنۡ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيۡهَا زَوۡجَيۡنِ اثۡنَيۡنِ ﴾

(القرآن: سورۃ ۱۳، آیت ۳)

"اسی نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کیے ہیں۔"

اعلیٰ درجے کے پودوں (Superior Plants) میں نسل خیزی کی آخری پیداوار اُن کے پھل (Fruits) ہوتے ہیں۔ پھل سے پہلے پھول کا مرحلہ ہوتا ہے جس میں نر اور مادہ اعضا (Organs) یعنی اسٹیمنز (Stamens) اور اوویولز (Ovules) ہوتے ہیں جب کوئی زردانہ (Pollen) کسی پھول تک پہنچتا ہے، تبھی وہ پھول "بار آور" ہو کر پھل میں بدلنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پھل پک جاتا ہے اور (اُس پودے کی) اگلی نسل کو جنم دینے والے بیج سے

لیس ہو کر تیار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تمام پھل اس امر کا پتا دیتے ہیں کہ (پودوں میں بھی) نر اور مادہ اعضا ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جسے قرآنِ پاک بہت پہلے بیان فرما چکا ہے۔

پودوں کی بعض انواع میں غیر بارآور (Non Fertilized) پھولوں سے بھی پھل بن سکتے ہیں۔ (جنہیں مجموعی طور پر ''پارتھینو کارپک فروٹ'' کہا جاتا ہے) ان میں کیلے کے علاوہ انناس، انجیر، نارنگی، اور انگور وغیرہ کی بعض اقسام شامل ہیں۔ ان پودوں میں بھی بہت واضح صنفی خصوصیات (Sexual Characteristics) موجود ہوتی ہیں۔

ہر چیز کو جوڑوں میں بنایا گیا ہے

﴿ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾

(القرآن، سورة ۵۱، آیت ۴۹)

''اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم اس سے سبق لو۔''

اس آیت مبارکہ میں '' ہر چیز'' کے جوڑوں کی شکل میں ہونے پر زور دیا گیا ہے۔ انسانوں، جانوروں، پودوں اور پھلوں کے علاوہ بہت ممکن ہے کہ یہ آیت مبارکہ بجلی کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہو کہ جس میں ایٹم منفی بار والے الیکٹرونوں اور مثبت بار والے مرکزے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے جوڑے ہو سکتے ہیں۔

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِىْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (القرآن، سورة ۳۶، آیت ۳۶)

''پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوعِ انسانی) میں سے یا اُن اشیا میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں۔''

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر چیز جوڑوں کی شکل میں پیدا کی گئی ہے، جن میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جنہیں آج کا انسان نہیں جانتا اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے کل میں انہیں دریافت کر لے۔

حیوانیات (Zoology)

جانوروں اور پرندوں میں معاشرے کا وجود

﴿ وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴾

(القرآن، سورۃ ۶، آیت ۳۸)

”زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں اور ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔“

تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ جانور اور پرندے بھی ”معاشروں“ (Communities) کی شکل میں رہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اُن میں بھی ایک اجتماعی نظم وضبط ہوتا ہے۔ وہ مل جل کر رہتے ہیں اور کام بھی کرتے ہیں۔

پرندوں کی پرواز

﴿ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۱۶، آیت ۷۹)

”کیا ان لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں کس طرح مسخر ہیں۔ اللہ کے سوا کس نے ان کو تھام رکھا ہے۔ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔“

ایک اور آیت مبارکہ میں پرندوں پر کچھ اس انداز سے بات کی گئی ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا

لیس ہو کر تیار ہو جاتا ہے۔لہٰذا تمام پھل اس امر کا پتا دیتے ہیں کہ (پودوں میں بھی) نر اور مادہ اعضا ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی سچائی ہے جسے قرآنِ پاک بہت پہلے بیان فرما چکا ہے۔

پودوں کی بعض انواع میں غیر بارآور (Non Fertilized) پھولوں سے بھی پھل بن سکتے ہیں۔ (جنہیں مجموعی طور پر ''پارتھینو کارپک فروٹ'' کہا جاتا ہے) ان میں کیلے کے علاوہ اناناس، انجیر، نارنگی، اور انگور وغیرہ کی بعض اقسام شامل ہیں۔ان پودوں میں بھی بہت واضح صنفی خصوصیات (Sexual Characteristics) موجود ہوتی ہیں۔

ہر چیز کو جوڑوں میں بنایا گیا ہے

﴿ وَمِنْ كُلِّ شَىْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾

(القرآن،سورۃ ۵۱، آیت ۴۹)

''اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم اس سے سبق لو۔''

اس آیت مبارکہ میں '' ہر چیز'' کے جوڑوں کی شکل میں ہونے پر زور دیا گیا ہے۔انسانوں ،جانوروں، پودوں اور پھلوں کے علاوہ بہت ممکن ہے کہ یہ آیت مبارکہ بجلی کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہو کہ جس میں ایٹم منفی باروالے الیکٹرونوں اور مثبت باروالے مرکزے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ان کے علاوہ اور بھی بہت سے جوڑے ہو سکتے ہیں۔

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِىْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (القرآن، سورۃ ۳۶، آیت ۳۶)

''پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کی نباتات میں سے ہوں یا خود ان کی اپنی جنس (یعنی نوعِ انسانی) میں سے یا اُن اشیا میں سے جن کو یہ جانتے تک نہیں۔''

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر چیز جوڑوں کی شکل میں پیدا کی گئی ہے،جن میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جنہیں آج کا انسان نہیں جانتا اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے کل میں انہیں دریافت کرلے۔

حیوانیات (Zoology)

جانوروں اور پرندوں میں معاشرے کا وجود

﴿ وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴾

(القرآن، سورۃ ۶، آیت ۳۸)

''زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں اور ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔''

تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ جانور اور پرندے بھی ''معاشروں'' (Communities) کی شکل میں رہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اُن میں بھی ایک اجتماعی نظم وضبط ہوتا ہے۔ وہ مل جل کر رہتے ہیں اور کام بھی کرتے ہیں۔

پرندوں کی پرواز

﴿ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ (القرآن: سورہ ۱۶، آیت ۷۹)

''کیا ان لوگوں نے کبھی پرندوں کو نہیں دیکھا کہ فضائے آسمانی میں کس طرح مسخر ہیں۔ اللہ کے سوا کس نے ان کو تھام رکھا ہے۔ اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔''

ایک اور آیت مبارکہ میں پرندوں پر کچھ اس انداز سے بات کی گئی ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا

الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍۭ بَصِیْرٌ ﴾ (القرآن: سورۃ، ٦٧، آیت ١٩)

''یہ لوگ اپنے اوپر اُڑنے والے پرندوں کو پر پھیلاتے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے؟ رحمان کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو وہی ہر چیز کا نگہبان ہے۔''

عربی لفظ ''امسک'' کا لغوی ترجمہ ''کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دینا، روکنا، تھامنا، یا کسی کی کمر پکڑ لینا'' ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں '' یُمْسِکُھُنَّ '' سے اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اپنے اختیار سے پرندوں کو ہوا میں تھامے رکھتا ہے، ان آیات ربانی میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ پرندوں کے طرزِ عمل کا مکمل انحصار اُنہی قوانین پر ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے تخلیق فرمایا ہے۔ (اور جنہیں ہم قوانین فطرت کے نام سے جانتے ہیں) جدید سائنسی معلومات سے ثابت ہو چکا ہے کہ بعض پرندوں میں پرواز کی بے مثل اور بے عیب صلاحیت کا تعلق اس وسیع تر اور مجموعی منصوبہ بندی (پروگرامنگ) سے ہے جو اُن کی حرکات و سکنات سے متعلق ہے۔ مثلاً ہزاروں میل دور تک نقل مکانی کرنے والے پرندوں کی جینیاتی رموز (جینیٹک کوڈز) میں اُن کے سفر کی تمام تر تفصیلات و جزئیات موجود ہوتی ہیں، جو ان پرندوں کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ نہایت کم عمری میں بھی لمبے سفر کے کسی تجربے کے بغیر، کسی رہنما کے بغیر ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر لیں اور پیچیدہ راستوں سے پرواز کرتے چلے جائیں۔ بات صرف سفر کی یک طرفہ تکمیل ہی پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ وہ ایک مخصوص تاریخ پر اپنے عارضی مسکن سے پرواز کرتے ہیں اور ہزاروں میل واپسی کا سفر کر کے ایک بار پھر اپنے گھونسلوں تک بالکل ٹھیک جا پہنچتے ہیں۔

پروفیسر ہیمبر گر نے اپنی کتاب ''پاور اینڈ فریجیلیٹی'' میں ''مٹن برڈ'' نامی ایک پرندے کی مثال دی ہے، جو بحرالکاہل کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ نقل مکانی کرنے والا یہ پرندہ ۲۴،۰۰۰ (چوبیس ہزار) کلومیٹر کا فاصلہ ۸ کی شکل میں چکر لگا کر طے کرتا ہے۔ یہ اپنا سفر چھ ماہ میں پورا کرتا ہے اور مقامِ ابتداء تک زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کی تاخیر سے واپس پہنچ جاتا ہے۔ ایسے کسی سفر کے لیے نہایت پیچیدہ معلومات کا ہونا ضروری ہے جو اس پرندے کے اعصابی خلیات

میں محفوظ ہونی چاہیں۔یعنی ایک باضابطہ ''پروگرام'' کی شکل میں پرندے کے جسم میں موجود اور ہمہ وقت دستیاب ہوتی ہے۔اگر پرندے میں کوئی پروگرام ہےتو کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اسے تشکیل دینے والا کوئی ''پروگرامر'' بھی یقیناً ہے؟

شہد کی مکھی اوراس کی مہارت

﴿ وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَo ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾

(القرآن: سورة،١٦،آيات ٦٨ تا ٦٩)

''اور دیکھوتمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اورٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں ، اپنے چھتے بنا اور ہرطرح کے پھلوں کا رس چوس اوراپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہےجس میں شفا ہےلوگوں کے لیے۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہےان لوگوں کے لیے جوغوروفکر کرتے ہیں۔''

وان فرش نے شہد کی مکھیوں کے طرزِعمل اوران میں رابطہ وابلاغ (کمیونی کیشن) کی تحقیق پر ۱۹۷۳ء کا نوبل انعام حاصل کیا۔شہد کی کسی مکھی کو جب کوئی نیا باغ یا پھول دکھائی دیتا ہےتو وہ اپنے چھتے میں واپس جاتی ہے اوراپنی ساتھی شہد کی مکھیوں کواُس مقام کی ٹھیک ٹھیک سمت اور وہاں پہنچانے والے راستے کے مفصل نقشے سے آگاہ کرتی ہے۔شہد کی مکھی، پیغام رسانی کا یہ کام خاص طرح کی جسمانی حرکات سے لیتی ہےجنہیں ''شہد کی مکھی کا رقص'' (Bee Dance) کہا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ عام معنوں والا رقص نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصد شہد کی ''کارکن مکھیوں'' (Worker Bees) کو یہ سمجھانا ہوتا ہے کہ پھول کس سمت ہیں اور وہاں تک پہنچنے کے لیے انہیں کس انداز سے پرواز کرنا ہوگی۔تاہم شہد کی مکھی کے بارے میں یہ

ساری معلومات ہم نے جدید فوٹو گرافی اور دیگر پیچیدہ مشاہداتی ذرائع ہی سے حاصل کی ہیں۔ لیکن ملاحظہ فرمایئے کہ مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں قرآنِ عظیم نے کتنی صراحت کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہد کی مکھی کو خاص طرح کی مہارت عطا فرمائی ہے، جس سے لیس ہو کر وہ اپنے رب کے بتائے ہوئے راستے تلاش کر لیتی ہے۔ ایک اور توجہ طلب نکتہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں شہد کی مکھی کے لیے جو صنف استعمال کی گئی ہے، وہ مادہ کی ہے (یعنی، فاسلکی اور کلی) اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غذا کی تلاش میں نکلنے والی شہد کی مکھی ''مادہ'' ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر سپاہی یا کارکن شہد کی مکھی بھی مادہ ہی ہوتی ہے۔

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ شیکسپیئر کے ڈرامے ''ہنری دی فورتھ'' میں بعض کردار شہد کی مکھیوں کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ (شہد کی) مکھیاں سپاہی ہوتی ہیں اور یہ کہ اُن کا بادشاہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شیکسپیئر کے زمانے میں لوگ یہی سمجھتے تھے اُن کا خیال تھا کہ شہد کی کارکن مکھیاں ''نر'' ہوتی ہیں اور وہ شہد کی ''بادشاہ مکھی'' (نر) کو جوابدہ ہوتی ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں۔ شہد کی کارکن مکھیاں مادہ ہوتی ہیں اور وہ شہد کی بادشاہ مکھی کو نہیں بلکہ ''ملکہ مکھی'' کو اپنی کارگزاری پیش کرتی ہیں۔ اب اس بارے میں کیا کہا جائے کہ گذشتہ ۳۰۰ سال کے دوران ہونے والی جدید تحقیق کی بدولت ہی ہم یہ سب کچھ دریافت کر پائے ہیں۔

مکڑی کا جالہ، ناپائیدار ترین گھر

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۹، آیت ۴۱)

''جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے۔''

مکڑی کے جالے کو نازک اور کمزور کے طور پر بیان کرنے کے علاوہ، قرآن پاک نے

مکڑی کے گھریلو تعلقات کے بھی نازک اور ناپائیدار ہونے پر زور دیا ہے۔ یہ صحیح بھی ہے، کیونکہ بیشتر اوقات مکڑی اپنے ملاپ کار (Mate) یعنی نر کو مار ڈالتی ہے۔ یہی مثال ایسے لوگوں کی کمزوریوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بھی دی گئی ہے جو دنیا اور آخرت میں تحفظ وکامیابی حاصل کرنے کے لیے اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے اس کی امید کرتے ہیں۔

چیونٹیوں کا طرزِ حیات اور باہمی روابط

﴿ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰىٓ اِذَآ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۷، آیات ۱۷ تا ۱۸)

"سلیمان علیہ السلام کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے، اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: "اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں اور انہیں خبر بھی نہ ہو۔"

ہوسکتا ہے کہ ماضی میں بعض لوگوں نے قرآن پاک میں چیونٹیوں کا مذکورہ بالا مکالمہ دیکھ کر اس پر نکتہ چینی کی ہو اور کہا ہو کہ چیونٹیاں تو صرف کہانیوں کی کتابوں ہی میں باتیں کرتی ہیں۔ البتہ، حالیہ برسوں کے دوران ہمیں چیونٹیوں کے طرزِ حیات باہمی روابط اور پیچیدہ معلومات کے تبادلے کے حوالے سے بہت کچھ علم ہو چکا ہے۔ یہ معلومات دورِ جدید سے پہلے کے انسانوں کو حاصل نہ تھیں۔ تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ وہ جانور یا وہ حشرات (کیڑے مکوڑے) جن کا طرزِ حیات انسانی معاشرت سے غیر معمولی مماثلت رکھتا ہے، وہ چیونٹیاں ہی ہیں۔ اس کی تصدیق چیونٹیوں کے بارے میں درج ذیل حالیہ دریافتوں سے بھی ہوتی ہے:

الف۔ چیونٹیاں بھی اپنے مردوں کو انسانوں کی طرح دفناتی ہیں۔

ب۔ ان میں کارکنان کی تقسیم کا پیچیدہ نظام موجود ہے جس میں منیجر، سپروائزر، فورمین اور مزدور وغیرہ شامل ہیں۔

ج۔ کبھی کبھار وہ آپس میں ملتی ہیں اور ''گفتگو'' (Chat) بھی کرتی ہیں۔

د۔ ان میں باہمی تبادلہ خیال (کمیونی کیشن) کا ترقی یافتہ نظام موجود ہے۔

ہ۔ ان کی کالونیوں میں باقاعدہ ''مارکیٹیں'' ہوتی ہیں جہاں وہ اشیا کا تبادلہ کرتی ہیں۔

ی۔ سردیوں میں لمبے عرصے تک زیرِ زمین رہنے کے لیے وہ اناج کے دانوں کا ذخیرہ بھی کرتی ہیں۔اور اگر کوئی دانہ پھوٹنے لگے، یعنی اس سے پودا بننے لگے تو وہ فوراً اس کی جڑیں کاٹ دیتی ہیں۔ جیسے انہیں یہ پتا ہو کہ اگر وہ اس دانے کو یونہی چھوڑ دیں گی تو وہ بڑھنا اور پکنا شروع کر دے گا۔اگر ان کا محفوظ کیا ہوا اناج کسی بھی وجہ سے مثلاً بارش سے گیلا ہو جائے تو وہ اسے اپنے بل سے باہر لے جاتی ہیں اور دھوپ میں سکھاتی ہیں۔ جب اناج سوکھ جاتا ہے تبھی وہ اسے بل میں واپس لے کر جاتی ہیں۔یعنی یوں لگتا ہے، جیسے انہیں یہ علم ہو کہ نمی کی وجہ سے اناج کے دانے سے جڑیں نکل پڑیں گی جو دانے کو اس قابل نہیں چھوڑیں گی کہ اسے کھایا جا سکے۔

طبّ (میڈیسن)

شہد: نوعِ انسانی کے لیے شفا

شہد کی مکھی کئی طرح کے پھلوں اور پھولوں کا رس چوستی ہے اور اسے اپنے ہی جسم کے اندر شہد میں تبدیل کرتی ہے۔ اس شہد کو وہ اپنے چھتے میں بنے خانوں (Cells) میں جمع کرتی ہے۔ آج سے صرف چند صدیوں قبل ہی انسان کو یہ معلوم ہوا ہے کہ شہد اصل میں شہد کی مکھی کے پیٹ (Belly) سے نکلتا ہے، مگر یہ حقیقت قرآن پاک نے ۱۴۰۰ سال پہلے درج ذیل آیت مبارکہ میں بیان کردی تھی:

﴿ ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۱۶، آیت ۶۹)

''ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس، اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہ پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے (پیٹ کے) اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔''

علاوہ ازیں ہم نے حال ہی میں یہ دریافت کیا ہے کہ شہد میں شفا بخش خصوصیات پائی جاتی ہیں اور یہ اوسط درجے کے دافع عفونت (مائلڈ اینٹی سیپٹک) کا کام بھی کرتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں روسیوں نے بھی اپنے زخمی فوجیوں کے زخم ڈھانپنے کے لیے شہد کا استعمال کیا تھا۔ شہد کی خاصیت ہے کہ یہ نمی کو برقرار رکھتا ہے اور بافتوں پر زخموں کے بہت ہی کم نشان باقی رہنے دیتا ہے۔ شہد کی کثافت (Density) کے باعث کوئی پھپوندی یا جراثیم، زخم میں پروان

نہیں چڑھ سکتے۔

سسٹر کیرول نامی ایک عیسائی راہبہ (Nun) نے برطانوی شفا خانوں میں سینے اور الزائیمر کے عارضوں میں مبتلا بائیس ۲۲ نا قابل علاج مریضوں کا علاج پروپولس (Propolis) نامی مادے سے کیا۔شہد کی مکھیاں یہ مادہ پیدا کرتی ہیں اور اسے اپنے چھتوں کو جرثوموں کے خلاف سر بند (Seal) کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی پودے سے ہونے والی الرجی میں مبتلا ہو جائے تو اسی پودے سے حاصل شدہ شہد اس شخص کو دیا جا سکتا ہے تا کہ وہ الرجی کے خلاف مزاحمت پیدا کر لے۔شہد وٹامن کے اور فرکٹوز (ایک طرح کی شکر) سے بھی بھر پور ہوتا ہے۔

قرآن پاک میں شہد اس کی تشکیل اور خصوصیات کے بارے میں جو علم دیا گیا ہے اسے انسان نے نزول قرآن کے صدیوں بعد اپنے تجربے اور مشاہدے سے دریافت کیا ہے۔

فعلیات (Physiology)

دورانِ خون (بلڈ سرکولیشن) اور دودھ

قرآن پاک کا نزول، دورانِ خون کی وضاحت کرنے والے اوّلین مسلمان سائنس دان ابن النفیس سے ۶۰۰ سال پہلے اور اس دریافت کو مغرب میں روشناس کروانے والے ولیم ہاروے سے ۱۰۰۰ سال پہلے ہوا تھا۔ تقریباً تیرہ صدیوں پہلے یہ معلوم ہوا کہ آنتوں کے اندر ایسا کیا کچھ ہوتا ہے جو نظام ہاضمہ میں انجام پانے والے افعال کے ذریعے دیگر جسمانی اعضا کی نشو ونما کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ قرآنِ پاک کی ایک آیت مبارک، جو دودھ کے اجزا کے ماخذ کی وضاحت کرتی ہے، اس تصور کی عین مطابقت میں ہے۔

مذکورہ بالا تصور کے حوالے سے آیت قرآنی کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا اہم ہے کہ آنتوں میں کیمیائی تعاملات (Reactions) واقع ہوتے ہیں اور یہ کہ آنتوں ہی سے ہضم کردہ غذا سے اخذ کیے ہوئے مادے ایک پیچیدہ نظام سے گزر کر دورانِ خون میں شامل ہوتے ہیں۔ کبھی وہ (مادّے) جگر سے ہو کر گزرتے ہیں جس کا انحصار ان کی کیمیائی ترکیب پر ہوتا ہے۔ خون ان اجزا (مادّوں) کو تمام اعضا تک پہنچاتا ہے، جن میں دودھ پیدا کرنے والے (چھاتیوں کے) غدود بھی شامل ہیں۔

سادہ الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنتوں میں موجود غذا کے بعض مادے آنتوں کی دیوار سے سرایت کرتے ہوئے خون کی نالیوں (Vessels) میں داخل ہو جاتے ہیں، اور پھر خون کے راستے یہ دورانِ خون کے ذریعے کئی اعضا تک جا پہنچتے ہیں۔ یہ فعلیاتی تصور مکمل طور پر لازماً ہماری گرفت میں آ جائے گا، اگر ہم قرآن پاک کی درج ذیل آیات مبارکہ کو سمجھنے کی کوشش کریں گے:

﴿ وَ اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴾ (القرآن: سورة١٦، آیت ٦٦)

''اور تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے ان کے پیٹ سے گوبر اور خون کے درمیان ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں، یعنی خالص دودھ، جو پینے والوں کے لیے نہایت خوشگوار ہے۔''

﴿ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴾ (القرآن: سورة ۲۳، آیت ۲۱)

''اور حقیقت یہ ہے کہ تمہارے لیے مویشیوں میں بھی ایک سبق ہے۔ ان کے پیٹوں میں جو کچھ ہے اسی میں سے ایک چیز (یعنی دودھ) ہم تمہیں پلاتے ہیں اور تمہارے لیے ان میں بہت سے فائدے بھی ہیں۔ ان کو تم کھاتے ہو۔''

۱۴۰۰ سال قبل، قرآن پاک کی فراہم کردہ یہ وضاحت جو گائے میں دودھ کے پیدا ہونے کے حوالے سے ہے، حیرت انگیز طور پر جدید فعلیات سے بھرپور انداز میں ہم آہنگ ہے جس نے اس حقیقت کو حال ہی میں دریافت کیا ہے۔

جنینیات (Embryology)

مسلمان جوابات کی تلاش میں

یمن کے معروف عالم، شیخ عبدالمجید الزندانی کی قیادت میں مسلمان اسکالروں کے ایک گروپ نے جنینیات (ایمبر یالوجی) اور دیگر (سائنسی) علوم کے بارے میں قرآن پاک اور مستند احادیث سے معلومات جمع کیں اور انہیں انگریزی میں ترجمہ کیا۔ پھر انہوں نے قرآن پاک کے ایک مشورے پر عمل کیا:

﴿ وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۱۶، آیت ۴۳)

"اے نبی! ہم نے تم سے پہلے بھی جب کبھی رسول بھیجے ہیں آدمی ہی بھیجے ہیں جن کی طرف ہم اپنے پیغامات وحی کیا کرتے تھے۔ اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم خود نہیں جانتے۔"

جب قرآن پاک اور مستند احادیث مبارکہ سے جنینیات کے بارے میں حاصل کی گئی معلومات یکجا ہو کر انگریزی میں ترجمہ ہو گئیں تو انہیں پروفیسر ڈاکٹر کیتھ مور کے سامنے پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر کیتھ مور، یونیورسٹی آف ٹورانٹو (کینیڈا) میں ڈیپارٹمنٹ آف اناٹومی کے سربراہ اور جنینیات کے پروفیسر ہیں۔ آج کل وہ جنینیات (ایمبر یالوجی) کے میدان میں مقتدر اور معتبر ترین شخصیت بھی ہیں۔ ان سے کہا گیا کہ وہ انہیں پیش کیے گئے علمی مواد کے بارے میں اپنی رائے دیں۔ محتاط مطالعے کے بعد ڈاکٹر کیتھ مور نے کہا کہ جنینیات کے متعلق آیات قرآنی اور مستند احادیث میں بیان کردہ تقریباً تمام معلومات، جدید سائنسی دریافتوں کی عین مطابقت ں ہیں جدید جنینیات سے ان کا بھرپور اتفاق ہے اور وہ کسی بھی طرح جدید جنینیات سے

اختلاف نہیں کرتیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ البتہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جن کی سائنسی درستگی کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ آیات (سائنس کی مطابقت میں) صحیح ہیں یا غلط، کیونکہ خود انہیں ان آیات میں دی گئی معلومات کے متعلق کچھ علم نہیں۔ ان کے متعلق جنینیات کے جدید مطالعات اور مقالہ جات تک میں بھی کچھ موجود نہ تھا۔ ایسی ہی ایک آیت مبارکہ درج ذیل ہے:

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ﴾

(القرآن: سورۃ ۹۶، آیات ۱ تا ۲)

”پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔“

یہاں عربی لفظ ”علق“ استعمال ہوا ہے جس کا ایک مطلب تو خون کا لوتھڑا ہے، جب کہ دوسرا مطلب کوئی ایسی چیز ہے جو ”چمٹ“ جاتی ہو، یعنی جونک جیسی کوئی شے ہو۔ ڈاکٹر کیتھ مور کو علم نہیں تھا کہ حمل کے ابتدائی مرحلوں میں جنین (ایمبریو) کی شکل جونک جیسی ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لیے انہوں نے نہایت طاقتور اور حساس آلات کی مدد سے جنین کے ابتدائی مراحل کا بڑے محتاط انداز میں مطالعہ کیا اور پھر ان تصاویر کا موازنہ جونک کے خاکے سے کیا۔ وہ ان دونوں کے درمیان غیر معمولی مشابہت دیکھ کر حیران رہ گئے، اسی طرح انہوں نے جنینیات کے بارے میں مزید معلومات حاصل کیں جو قرآن پاک سے تھیں اور جن سے وہ قبل ازیں واقف نہیں تھے۔

ڈاکٹر کیتھ مور نے جنینیاتی معلومات سے متعلق قرآن وحدیث سے حاصل شدہ مواد پر تقریباً ۸۰ سوالوں کے جوابات دیے، قرآن وحدیث میں جنینیات کے حوالے سے موجود علم صرف جدید سائنسی معلومات سے ہم آہنگ ہی نہ تھا بلکہ بقول ڈاکٹر کیتھ مور اگر آج سے تیس سال پہلے مجھ سے یہی سب سوالات کیے جاتے تو سائنسی معلومات کی عدم موجودگی کے باعث میں ان میں سے آدھے سوالوں کے جوابات بالکل بھی نہیں دے سکتا تھا۔

۱۹۸۱ء میں دمام (سعودی عرب) میں منعقدہ، ساتویں طبی کانفرنس کے دوران ڈاکٹر مور نے کہا ''میرے لیے نہایت خوشی کا مقام ہے کہ میں نے قرآن میں انسان کی (دورانِ حمل) نشوونما سے متعلق پیش کردہ نکات کی وضاحت کرنے میں مدد کی۔ اب مجھ پر یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہ ساری معلومات محمد (ﷺ) تک خدایا اللہ نے ہی پہنچائی ہیں کیونکہ کم وبیش یہ سارا علم (نزول قرآن کے) کئی صدیوں بعد ہی دریافت کیا گیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد (ﷺ) بلاشبہ خدایا اللہ کے رسول ہی تھے۔''

قبل ازیں ڈاکٹر کیتھ مور ایک کتاب ''دی ڈیویلپنگ ہیومین'' لکھ چکے تھے۔ قرآن پاک سے نئی معلومات سے حاصل ہو جانے کے بعد انہوں نے ۱۹۸۲ء میں اسی کتاب کا تیسرا ایڈیشن مرتب کیا۔ اس ایڈیشن کو عالمی پذیرائی حاصل ہوئی اور اس کتاب نے کسی ایک مصنف کی لکھی ہوئی بہترین طبی کتاب کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ یہ کتاب دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اور اسے میڈیکل کی تعلیم کے پہلے سال میں اک نصابی کتاب کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر جو سمپسن، بیلر کالج آف میڈیسن، ہیوسٹن (امریکہ) میں شعبہ حمل وزچگی (آبسٹیٹرکس اینڈ گائناکولوجی) کے چیئرمین ہیں۔ ان کا کہنا ہے ''یہ احادیث، محمد (ﷺ) کی کہی ہوئی باتیں، کسی بھی طرح مصنف کے زمانے (ساتویں صدی عیسوی) میں دستیاب سائنسی معلومات کی بنیاد پر پیش نہیں کی جا سکتی تھیں، اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوا کہ جنیات (Genetics) اور مذہب (یعنی اسلام) میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ بھی پتا چلا کہ مذہب (اسلام) اس طرح سے سائنس کی رہنمائی کر سکتا ہے کہ روایتی سائنسی اندازِ نظر میں کچھ الہامی انکشافات بھی شامل کرتا چلا جائے۔ قرآن میں ایسے بیانات موجود ہیں جن کی توثیق کئی صدیوں بعد ہوئی۔ جس سے اس (یقین) کو تقویت ملتی ہے کہ قرآن میں دیا گیا علم واقعی خدا کی طرف سے آیا ہے۔''

ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان سے خارج ہونے والا قطرہ

﴿ فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ ٥ خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ ٥ يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ ﴾ (القرآن: سورۃ ۸۶، آیات ۵ تا ۷)

''پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔''

جنینی مراحل میں مردانہ و زنانہ تولیدی اعضاء یعنی فوطے (Testicles) اور بیضہ دان (Ovary) گردوں پاس سے ریڑھ کی ہڈی اور گیارہویں / بارہویں پسلیوں کے درمیان سے نموپذیر ہونا شروع کرتے ہیں۔ بعدازاں وہ کچھ نیچے اتر آتے ہیں؛ زنانہ تولیدی غدود (Gonads) یعنی بیضہ دانیاں پیڑو (Pelvis) میں رک جاتی ہیں جب کہ مردانہ اعضائے تولید (Inguinal Canal) کے راستے خصیہ دانی (Scrotum) تک جا پہنچتے ہیں۔ حتیٰ کہ بلوغت میں بھی جب کہ تولیدی غدود کے نیچے سرکنے کا عمل رک چکا ہوتا ہے ان غدود میں دھڑ والی اورطہ (Abdominal Aorta) کے ذریعے خون اور اعصاب کی رسائی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ دھیان رہے کہ دھڑ والی اورطہ اُس علاقے میں ہوتی ہے جو ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ لمفی نکاس (Lymphetic Drainage) اور خون کا وریدی بہاؤ بھی اس سمت ہوتا ہے۔

نطفہ: مائع کی معمولی سی مقدار

قرآن عظیم میں کم از کم گیارہ مرتبہ کہا گیا ہے کہ انسان کو ''نطفہ'' سے تخلیق کیا گیا ہے جس کا مطلب مائع کی نہایت معمولی مقدار یا پیالہ خالی ہو جانے کے بعد اس میں لگا رہ جانے والا مائع ہے۔ یہ بات قرآنِ عالی شان کی کئی آیات مبارکہ میں وارد ہوئی ہے جن میں سورۃ ۲۲ آیت ۵ اور سورۃ ۲۳، آیت ۱۳ کے علاوہ سورۃ ۱۶، آیت ۴؛ سورۃ ۱۸ آیت ۳۷؛ سورۃ ۳۵، آیت ۱۱؛ سورۃ ۳۶، آیت ۷۷؛ سورۃ ۴۰ آیات ۶۷؛ سورۃ ۵۳، آیت ۴۶؛ سورۃ ۷۶، آیت ۲؛ اور سورۃ ۸۰ آیت ۱۹ شامل ہیں۔

سائنس نے حال ہی میں یہ دریافت کیا ہے کہ بیضے (Ovum) کو بار آور کرنے کے لیے اوسطاً تیس لاکھ خلیاتِ نطفہ (Sperms) میں سے صرف ایک کی ضرورت ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ خارج ہونے والے نطفے کی مقدار کا تیس لاکھواں حصہ یا ۰٫۰۰۰۰۳ فیصد مقدار ہی بار آوری (حمل ٹھہرانے) کے لیے کافی ہوتی ہے۔

"سُلٰلَة": مائع کا جوہر

﴿ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴾ (القرآن: سورة، ۳۲، آیت ۸)

"پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح ہے۔"

عربی لفظ سُلٰلَة سے مراد کسی مائع کا بہترین حصہ، خلاصہ یا جوہر ہے۔ اب ہم جان چکے ہیں زنانہ بیضے کی بار آوری کے لیے مرد سے خارج ہونے والے لاکھوں کروڑوں خلیاتِ نطفہ میں سے صرف ایک کی ضرورت ہوتی ہے۔ لاکھوں کروڑوں میں سے اسی ایک خلیۂ نطفہ کو قرآنِ پاک نے "سُلٰلَة" کہا ہے۔ اب ہمیں یہ بھی پتا چل چکا ہے کہ عورت میں پیدا شدہ ہزاروں بیضوں (Ovam) میں سے صرف ایک ہی بار آور ہوتا ہے۔ ان ہزاروں بیضوں میں سے اسی ایک بیضے کے لیے (جو بار آور ہوتا ہے) قرآنِ پاک نے "سُلٰلَة" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس لفظ کا ایک اور مفہوم کسی مائع سے (کسی چیز کا) بڑی احتیاط سے اخراج بھی ہے۔ اس مائع سے مراد زنانہ اور مردانہ، دونوں طرح کے تولیدی مائعات بھی ہیں جن میں صنفی تخم (Gametes) موجود ہوتے ہیں۔ بار آوری کے مرحلے کے دوران نطفہ خلیہ اور بیضہ دونوں ہی اپنے اپنے ماحول سے بہ احتیاط جدا ہوتے ہیں۔

نطفةٍ اَمشاج..... باہم ملے ہوئے مائعات

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴾ (القرآن: سورة ۷۶، آیت ۲)

"ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔"

عربی لفظ" نطفة اَمشاج " کا مطلب ملے ہوئے مائعات" ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک ملے ہوئے مائعات سے مراد عورت یا مرد کے (تولیدی) عامل (ایجنٹ) یا مائعات ہیں مردانہ اور زنانہ صنفی تخم کے باہم مل جانے کے بعد بننے والا جفتہ (Zygote) بھی ابتدا میں نطفہ ہی رہتا ہے۔ باہم ملے ہوئے (ہم آمیز) مائعات سے ایک اور مراد وہ مائع بھی ہوسکتا ہے جس میں خلیاتِ نطفہ تیر رہے ہوتے ہیں۔ یہ مائع کئی طرح کی جسمانی رطوبتوں سے مل کر بنتا ہے جو کئی جسمانی غدود سے خارج ہوتی ہیں۔

لہٰذا، "نطفةٍ امشاج "یعنی آپس میں ملے ہوئے مائعات کے ذریعے مردانہ و زنانہ صنفی مواد (تولیدی مائع یا خلیات) اور اس کے اردگرد مائعات کے کچھ حصے کی جانب اشارہ کیا جارہا ہے۔

جنس کا تعین

پختہ جنین (Foetus) کی جنس کا تعین (یعنی اس سے لڑکا ہوگا یا لڑکی) خلوی نطفے سے ہوتا ہے نہ کہ بیضہ سے مطلب یہ کہ رحم مادر میں ٹھہرنے والے حمل سے لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی اس کا انحصار کروموسوم کے 23ویں جوڑے میں بالترتیب XX/XY کروموسومز کی موجودگی پر ہوتا ہے۔ ابتدائی طور پر جنس کا تعین بارآوری کے موقع ہی پر ہو جاتا ہے اور اس کا انحصار خلوی نطفے (اسپرم) کے صنفی کروموسوم (سیکس کروموسوم) پر ہوتا ہے جو بیضے کو بارآور کرتا ہے۔ اگر بیضے کو بارآور کرنے والے اسپرم میں X صنفی کروموسوم ہے تو ٹھہرنے والے حمل سے لڑکی پیدا ہو گی۔ اس کے برعکس، اگر اسپرم میں صنفی کروموسوم Y ہے تو حمل کے نتیجے میں لڑکا پیدا ہوگا۔

﴿ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ٥ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى٥ ﴾

(القرآن: سورة ۵۳، آیات ۴۵ تا ۴۶)

"اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا، ایک بوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔"

یہاں عربی لفظ نطفہ کا مطلب تو مائع کی نہایت قلیل مقدار ہے جب کہ " تُمنىٰ "کا

مطلب شدت سے ہونے والا اخراج یا پودے کی طرح بوئی گئی کوئی چیز ہے۔ لہٰذا نطفہ بطورِ خاص اسپرم ہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کیونکہ یہ شدت سے خارج ہوتا ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمۡ یَكُ نُطۡفَةً مِّنۡ مَّنِیٍّ یُّمۡنٰیۙ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰیۙ فَجَعَلَ مِنۡهُ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰی ﴾

(القرآن: سورۃ ۷۵، آیات ۳۷، ۳۹)

''کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحمِ مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔''

ملاحظہ فرمایئے کہ یہاں ایک بار پھر یہ بتایا گیا ہے کہ نہایت قلیل مقدار (قطرے) پر مشتمل مادۂ تولید (جس کے لیے عربی عبارت '' نطفة مّن مّنيٍّ '' وارد ہوئی ہے) جو کہ مرد کی طرف سے آتا ہے) رحمِ مادر میں بچے کی جنس کے تعین کا ذمہ دار ہے۔ برصغیر میں یہ افسوس ناک رواج ہے کہ عام طور پر ساسوں کو پوتیوں سے زیادہ پوتوں کا ارمان ہوتا ہے۔ اور اگر بہو کے ہاں بیٹوں کے بجائے بیٹیاں ہو رہی ہوں تو وہ انہیں ''اولادِ نرینہ'' پیدا نہ کر سکنے پر طعنے دیتی ہیں۔ اگر انہیں صرف یہی پتا چل جاتا کہ اولاد کی جنس کے تعین میں عورت کے بیضے کا کوئی کردار نہیں اور اس کی تمام تر ذمہ داری مردانہ نطفے پر عاید ہوتی ہے اور اگر پھر بھی وہ لعن طعن پر آمادہ ہوں تو انہیں چاہیے کہ وہ (اولاد نرینہ کے نہ ہونے پر) اپنی بہوؤں کے بجائے اپنے بیٹوں کو کوسنے دیں۔ قرآنِ پاک اور جدید سائنس دونوں ہی اس پر متفق ہیں کہ بچے کی جنس کے تعین میں مردانہ تولیدی مواد ہی ذمہ دار ہے، عورت کا اس میں کوئی قصور نہیں۔

تین تاریک پردوں کی حفاظت میں رکھا گیا بطن

﴿ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَاَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ الۡاَنۡعَامِ ثَمٰنِیَةَ اَزۡوَاجٍ یَخۡلُقُكُمۡ فِیۡ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِكُمۡ خَلۡقًا مِّنۡۢ بَعۡدِ

خَلْقٍ فِيْ ظُلُمَاتٍ ثَلاَثٍ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴾ (القرآن:سورۃ ۳۹، آیت ۶)

''اسی نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ پھر وہی ہے جس نے اس جان سے اس کا جوڑا بنایا اور اسی نے تمہارے لیے مویشیوں میں سے آٹھ نر و مادہ پیدا کیے۔ اور وہ تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تاریک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل دیتا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے۔ بادشاہی اسی کی ہے، کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے۔ پھر تم کدھر سے پھرائے جارہے ہو۔''

پروفیسر ڈاکٹر کیتھ مور کے مطابق، قرآن پاک میں تاریکی کے جن تین پردوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

1. شکمِ مادر کی اگلی دیوار
2. رحمِ مادر کی دیوار
3. غلافِ جنین اور اس کے گرد لپٹی ہوئی جھلی

جنینی (ایمبریانک) مراحل

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَئْنٰهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۳، آیت ۱۲ تا ۱۴)

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔''

ان آیاتِ مبارک میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان کو مائع کی نہایت قلیل مقدار سے تخلیق کیا گیا ہے جسے سکون (Rest) والی جگہ میں رکھ دیا جاتا ہے۔ یہ (مائع) اُس جگہ پر مضبوطی سے چمٹا رہتا ہے۔ (یعنی قیام پذیر حالت میں جکڑے ہوئے) اور اسی کے لیے قرآن پاک میں ''قرارِ مکین'' کی عبارت وارد ہوئی ہے۔ رحمِ مادر کے پچھلے حصے کو ریڑھ کی ہڈی اور کمر کے پٹھوں کی بدولت کافی تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ اس جنین (ایمبریو) کو مزید تحفظ جینی تھیلی (Amniotic Sac) سے حاصل ہوتا ہے جس میں جینی مائع (Amniotic Fluid) بھرا ہوتا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ رحمِ مادر ایک ایسی ''جائے قرار'' (رُکنے کی جگہ) ہے جسے بخوبی تحفظ دیا گیا ہے۔

مائع کی مذکورہ قلیل مقدار ''علقۃ'' کی شکل میں ہوتی ہے یعنی ایک ایسی چیز کی شکل میں جو ''چمٹ جائے'' کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس سے مراد جونک جیسی کوئی چیز بھی ہے۔ یہ دونوں توضیحات سائنسی اعتبار سے قابلِ قبول ہیں، کیونکہ بالکل ابتدائی مراحل میں جنین واقعتاً رحمِ مادر کی دیوار سے چمٹ جاتا ہے جب کہ اس کی ظاہری شکل بھی کسی جونک سے مشابہت رکھتی ہے۔ اس کا طرزِ عمل بھی جونک ہی کی طرح کا ہوتا ہے، کیونکہ یہ آنول نال کے راستے اپنی ماں کے جسم سے خون حاصل کرتا (اور اس سے اپنی غذا اخذ کرتا) ہے۔

علقۃ کا تیسرا مطلب ''خون کا لوتھڑا'' ہے۔ اس ''علقۃ'' والے مرحلے سے جو حمل ٹھہرنے کے تیسرے اور چوتھے ہفتے پر محیط ہوتا ہے۔ بند رگوں کے اندر خون جمنے لگتا ہے۔ لہٰذا جنین کی شکل صرف جونک جیسی ہی نہیں رہتی بلکہ وہ خون کے لوتھڑے جیسا بھی دکھائی دینے لگتا ہے۔

اب ہم قرآنِ پاک کی فراہم کردہ معلومات، اور صدیوں کی جدوجہد کے بعد سائنس کی حاصل کردہ جدید معلومات کا موازنہ کریں گے۔

۱۶۷۷ء میں ہیم اور لیون ہاک وہ دو اوّلین سائنسدان تھے، جنہوں نے خوردبین سے انسانی خلیاتِ نطفہ (اسپرماٹوزوآ) کا مطالعہ کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ نطفے کے ہر خلیے میں ایک چھوٹا سا انسان موجود ہوتا ہے جو رحمِ مادر میں پروان چڑھتا ہے اور ایک نوزائیدہ بچے کی

شکل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس نظریے کو ''پرفوریشن تھیوری'' بھی کہا جاتا تھا۔ بعدازاں جب سائنس دانوں نے یہ دریافت کیا کہ (عورت کا) بیضہ، نطفے کے خلیے سے کہیں زیادہ بڑا ہوتا ہے تو مشہور ماہر ڈی گراف سمیت کئی سائنس دانوں نے یہ سمجھنا شروع کردیا کہ بیضے کے اندر ہی انسانی وجود نہایت مختصر (خردبینی) حالت میں پایا جاتا ہے۔ اس کے بھی بہت عرصے بعد، اٹھارہویں صدی عیسوی میں (Maupeitius) نامی سائنسدان نے اس نظریے کی تشہیر کرنا شروع کی کہ (مذکورہ بالا دونوں ابتدائی خیالات کے برعکس) کوئی بچہ اپنے ماں اور باپ دونوں کی مشترکہ وراثت (Inheritence) ہوتا ہے۔

علقہ تبدیل ہوتا ہے اور ''مضغۃ'' کی شکل میں آتا ہے، جس کا مطلب ہے ایسی کوئی چیز جسے چبایا گیا ہو (یعنی جس پر دانتوں کے نشانات ہوں) اور کوئی ایسی چیز ہو جو چپچپی (لیس دار) اور مختصر ہو یعنی جسے چیونگم کی طرح منہ میں رکھا جا سکتا ہو۔ یہ دونوں توضیحات سائنسی اعتبار سے درست ہیں۔ پروفیسر کیتھ مور نے پلاسٹوسین (ربر اور چیونگم جیسے مادے) کا ایک ٹکڑا لے کر اسے ابتدائی مرحلے والے جنین کی شکل دی اور دانتوں سے چبا کر ''مضغہ'' میں تبدیل کیا۔ پھر انہوں نے اس (تجرباتی) مضغہ کی ساخت کا موازنہ ابتدائی جنین (Foetus) کی تصاویر سے کیا۔ اس پر موجود، دانتوں کے نشانات انسانی مضغہ پر پڑے ''سومائٹس'' (Somites) سے مشابہ تھے جو (جنین میں) ریڑھ کی ہڈی کی ابتدائی شکل کو ظاہر کرتے ہیں۔

اگلے مرحلے میں یہ مضغہ تبدیل ہو کر ہڈیوں کا روپ (عِظٰم) دھارتا ہے۔ ان ہڈیوں کے گرد نازک اور مہین گوشت یا پٹھوں (لحم) کا غلاف ہوتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اسے ایک بالکل ہی الگ مخلوق کی شکل دے دیتا ہے۔

امریکہ میں چوٹی کے ایک سائنسدان پروفیسر مارشل جونس سے (جو فلاڈلفیا میں واقع تھومس جیفرسن یونیورسٹی میں اناٹومی ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ اور اسی یونیورسٹی میں ڈینٹل انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر بھی ہیں) یہ کہا گیا کہ وہ جنینیات کے حوالے سے آیاتِ قرآنی پر تبصرہ کریں پہلے انہوں نے کہا کہ متعدد جنینی مراحل کو بیان کرنے والی قرآنی آیات کسی بھی طرح سے

اتفاق کا حاصل نہیں ہو سکتیں، اور ہو سکتا ہے کہ محمد (ﷺ) کے پاس بہت ہی طاقتور خردبین رہی ہو۔ جب انہیں یہ یاد دلایا گیا کہ قرآنِ پاک کا نزول ۱۴۰۰ سال پہلے ہوا تھا اور دنیا کی اوّلین خردبین بھی حضرت محمد (ﷺ) کے سینکڑوں سال بعد ایجاد ہوئی تھی، تو پروفیسر جونس ہنسے اور یہ تسلیم کیا ایجاد ہونے والی اولین خردبین بھی دس گنا سے زیادہ بڑی شبیہ دکھانے کے قابل نہیں تھی اور اس کی مدد سے واضح (خردبینی) منظر بھی دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ بعد ازاں انہوں نے کہا: ''سردست مجھے اس تصور میں کوئی تنازعہ دکھائی نہیں دیتا کہ جب محمد (ﷺ) نے قرآنِ پاک کی آیات پڑھیں تو اُس وقت یقیناً کوئی آسمانی (الہامی) قوت بھی ساتھ میں کارفرما تھی۔''

ڈاکٹر کیتھ مور کا کہنا ہے کہ جنینی نشوونما کے مراحل کی وہ درجہ بندی جو آج ساری دنیا میں رائج ہے، آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کیونکہ اس میں ہر مرحلے کو ایک عدد (نمبر) کے ذریعے شناخت کیا جاتا ہے۔ مثلاً مرحلہ نمبر ۱ مرحلہ نمبر ۲ وغیرہ۔ دوسری جانب قرآنِ پاک نے جنینی مراحل کی جو تقسیم بیان فرمائی ہے اس کی بنیاد جداگانہ اور بہ آسانی شناخت ہونے کے قابل حالتوں یا ساختوں پر ہے۔ یہی وہ مراحل ہیں جن سے کوئی جنین مرحلہ وار انداز میں گزرتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ حالتیں، (ساختیں) بھی قبل از ولادت نشوونما کے مختلف مراحل کی علمبردار ہیں اور ایسی سائنسی توضیحات (وضاحتیں) فراہم کرتی ہیں جو نہایت عمدہ اور قابلِ فہم ہونے کے ساتھ ساتھ عملی اہمیت بھی رکھتی ہیں۔ رحمِ مادر میں انسانی جنین کی نشوونما کے مختلف مراحل درج ذیل آیاتِ مبارکہ میں بھی بیان فرمائے گئے ہیں:

﴿ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝
فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ ﴾

(القرآن: سورۃ۷۵، آیات ۳۷ تا ۳۹)

''کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے پھر اس سے مرد

اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔"

﴿ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ ○ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ○ ﴾ (القرآن: سورۃ، ۸۲، آیات ۷ تا ۸)

"جس نے تجھے پیدا کیا، تجھے نک سک سے درست کیا، تجھے متناسب بنایا اور جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ کر تیار کیا۔"

نیم مکمل اور نیم نامکمل جنین

اگر مضغہ کے مرحلے پر جنین کو درمیان سے کاٹا جائے اور اس کے اندرونی حصوں کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں واضح طور پر نظر آئے گا کہ (مضغہ کے اندرونی اعضا میں سے) بیشتر پوری طرح بن چکے ہیں جب کہ بقیہ اعضا اپنی تکمیل کے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ پروفیسر جونس کا کہنا ہے کہ اگر ہم پورے جنین کو ایک مکمل وجود کے طور پر بیان کریں تو ہم صرف اسی حصے کی بات کر رہے ہوں گے جو پہلے سے مکمل ہو چکا ہے۔ اور اگر ہم اسے نامکمل وجود کہیں تو پھر ہم جنین کے ان حصوں کا حوالہ دے رہے ہوں گے جو ابھی پوری طرح سے مکمل نہیں ہوئے بلکہ تکمیل کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس موقع پر جنین کو کیا کہنا چاہیے: مکمل وجود یا نامکمل وجود؟ جنینی نشوونما کے اس مرحلے کی جو وضاحت قرآن پاک نے ہمیں دی ہے، اس سے بہتر کوئی اور وضاحت ممکن نہیں۔ قرآن پاک اس مرحلے کو "نیم مکمل اور نیم نامکمل" قرار دیتا ہے۔ درج ذیل آیات مبارکہ ملاحظہ فرمایئے:

﴿ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَیْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمْ وَ نُقِرُّ فِی الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲۲ آیت ۵)

"لوگو! اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر

گوشت کی بوٹی سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس (نطفے) کو چاہتے ہیں ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں (پھر تمہیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔''

سائنسی نقطۂ نگاہ سے ہم جانتے ہیں کہ جنینی نشو ونما کے اس ابتدائی مرحلے پر کچھ خلیات ایسے ہوتے ہیں جو جداگانہ شکل اختیار کر چکے ہیں جب کہ کچھ خلیات امتیازی شکل میں آئے نہیں ہوتے۔ یعنی کچھ اعضا بن چکے ہوتے ہیں اور کچھ ہنوز غیر تشکیل شدہ حالت میں ہوتے ہیں۔

سننے اور دیکھنے کی حسیات

رحم مادر میں نشو ونما پانے والے انسانی وجود میں سب سے پہلے جو حس جنم لیتی ہے وہ سننے کی حس (حس سامعہ) ہوتی ہے۔ ۲۴ ہفتوں بعد کا پختہ جنین (Foetus) آوازیں سننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ پھر حمل کے ۲۸ ویں ہفتے تک دیکھنے کی حس (بصارت بھی وجود میں آ جاتی ہے اور پردۂ چشم (Retina) روشنی کے لیے حساس ہو جاتا ہے۔ ان مراحل کو قرآنِ پاک یوں بیان فرماتا ہے:

﴿ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴾ (القرآن: سورہ ۳۲ آیت ۹)

''پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور دل دیے تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔''

﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴾ (القرآن: سورۃ ۷۶، آیت ۲)

''ہم نے انسان کو ایک مخلوط نطفے سے پیدا کیا تاکہ اس کا امتحان لیں اور اس غرض کے لیے ہم نے اسے سننے اور دیکھنے والا بنایا۔''

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ اَنشَاَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ ﴾ (القرآن: سورۃ، ۲۳، آیت۷۸)

”وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہیں دیکھنے اور سننے کی قوتیں دیں اور سوچنے کو دل دیے مگر تم لوگ کم ہی شکرگزار ہوتے ہو۔“

ملاحظہ فرمایے کہ تمام آیات مبارکہ میں حسِ سماعت کا تذکرہ حسِ بصارت سے پہلے آیا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ قرآنِ پاک کی فراہم کردہ توضیحات، جدید جنینیات میں ہونے والی دریافتوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔

عمومی سائنس

نشاناتِ انگشت (فنگر پرنٹس)

﴿ اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَهٗ o بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ o ﴾ (القرآن: سورۃ۷۵، آیات ۳تا۴)

''کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔''

کفار اور ملحدین یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص مرجانے کے بعد مٹی میں مل جاتا ہے اور اس کی ہڈیاں تک خاک کا پیوند ہو جاتی ہیں، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ قیامت کے روز اُس کے جسم کا ایک ایک ذرہ دوبارہ یکجا ہو کر پہلے والی (زندہ) حالت میں واپس آ جائے......اور اگر ایسا ہو بھی گیا تو روزِ محشر اس شخص کی ٹھیک ٹھیک شناخت کیونکر ہو گی؟ اللہ تعالیٰ ربِ ذوالجلال نے مذکورہ بالا آیات مبارکہ میں اسی اعتراض کا بہت واضح جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ (اللہ تعالیٰ) صرف اسی پر قدرت نہیں رکھتا کہ ریزہ ریزہ ہڈیوں کو واپس یکجا کر دے۔ بلکہ اس پر بھی قادر ہے کہ ہماری انگلیوں کی پَوروں تک کو دوبارہ سے پہلے والی حالت میں ٹھیک ٹھیک طور پر لے آئے۔

سوال یہ ہے کہ جب قرآنِ پاک انسانوں کی انفرادی شناخت کی بات کر رہا ہے تو ''انگلیوں کی پوروں'' کا خصوصیت سے تذکرہ کیوں کر رہا ہے؟ سر فرانس گالٹ کی تحقیق کے بعد ۱۸۸۰ء میں نشاناتِ انگشت (فنگر پرنٹس) کو شناخت کے سائنسی طریقے کا درجہ حاصل ہوا۔ آج ہم یہ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں کوئی سے بھی دو افراد کی انگلیوں کے نشانات کا نمونہ بالکل ایک جیسا نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ ہم شکل جڑواں افراد کا بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر میں

مجرموں کی شناخت کے لیے ان کے فنگر پرنٹس ہی استعمال کیے جاتے ہیں۔

کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے کس کو نشاناتِ انگشت کی انفرادیت کے بارے میں معلوم تھا؟ یقیناً یہ علم رکھنے والی ذات اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔

جلد میں درد کے آخذے (Receptors)

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ محسوسات اور درد وغیرہ کا انحصار صرف اور صرف دماغ پر ہوتا ہے۔ البتہ حالیہ دریافتوں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ جلد میں درد کو محسوس کرنے والے آخذے (Receptors) ہوتے ہیں۔ اگر یہ خلیات نہ ہوں تو انسان درد کو محسوس کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

جب کوئی ڈاکٹر کسی مریض میں جلنے کے باعث پڑنے والے زخموں کا معائنہ کرتا ہے تو وہ جلنے کا درجہ (شدت) معلوم کرنے کے لیے (جلے ہوئے مقام پر) سوئی چبھو کر دیکھتا ہے۔ اگر سوئی چبھنے سے متاثرہ شخص کو درد محسوس ہوتا ہے تو ڈاکٹر کو اس پر خوشی ہوتی ہے ..... کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جلنے کا زخم صرف باہر کی حد تک ہے اور درد محسوس کرنے والے خلیات (درد کے آخذے) محفوظ ہیں۔ اس کے برخلاف، اگر متاثرہ شخص کو سوئی چبھنے پر درد محسوس نہ ہو تو یہ تشویشناک امر ہوتا ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جلنے سے بننے والے زخم کی گہرائی زیادہ ہے اور درد کے آخذے بھی مردہ ہو چکے ہیں۔

درج ذیل آیت مبارکہ میں قرآن پاک نے بہت واضح الفاظ میں درد کے آخذوں کی موجودگی کے بارے میں بیان فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴾ (القرآن سورۃ ۴، آیت ۵۶)

"جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کر دیا ہے انہیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے اور جب ان کے بدن کی کھال گل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔ اللہ بڑی قدرت رکھتا

ہے اور اپنے فیصلوں کو عمل میں لانے کی حکمت خوب جانتا ہے۔''

تھائی لینڈ میں چیانگ مائی یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ آف اناٹومی کے سربراہ پروفیسر تیگاتات تیجاسان نے درد کے آخذوں پر تحقیق میں بہت وقت صرف کیا ہے۔ پہلے تو انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ قرآنِ پاک نے ۱۴۰۰ سال پہلے اس سائنسی حقیقت کا انکشاف کردیا ہو گا۔ تاہم، بعدازاں جب انہوں نے مذکورہ آیت قرآنی کے ترجمے کی باقاعدہ تصدیق کرلی تو وہ قرآن پاک کی سائنسی درستگی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سعودی عرب کے شہر ریاض میں منعقدہ آٹھویں سعودی طبی کانفرنس کے موقع پر (جس کا موضوع قرآنِ پاک اور سنت میں سائنسی نشانیاں تھا) انہوں نے بھرے مجمعے میں فخر وانبساط کے ساتھ کہا:

لا اِلٰه اِلَّا اللّٰه محمد الرسول اللّٰه

(اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں (اور) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے رسول ہیں)

حرفِ آخر

قرآن پاک میں سائنسی حقائق کی موجودگی کو اتفاق قرار دینا بیک وقت عقلِ سلیم (کامن سینس) اور صحیح سائنسی اندازِ نظر کے بالکل خلاف ہو گا۔ درحقیقت قرآنی آیات کی سائنسی درستگی قرآن پاک کے واضح اعلان کی تائید کرتی ہے:

﴿ سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾

(القرآن: سورۃ ۴۱، آیت ۵۳)

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ کافی نہیں کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔''

قرآن پاک تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کریں:

﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾ (القرآن: سورۃ ۳، آیت ۱۹۰)

''زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوش مندوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔''

قرآن پاک میں موجود سائنسی شواہد واشگاف انداز میں ثابت کرتے ہیں کہ یہ واقعی الہامی ذریعے سے نازل ہوا ہے۔ آج سے چودہ سو سال پہلے کوئی انسان ایسا نہیں تھا جو اس قدر اہم اور درست سائنسی حقائق پر مبنی کوئی کتاب لکھ سکتا۔

تاہم قرآن پاک کوئی سائنسی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ "نشانیوں" (Signs) کی کتاب ہے۔ یہ نشانیاں انسان کو دعوت دیتی ہیں کہ وہ زمین پر اپنے وجود کی غرض وغایت کا احساس کرے اور فطرت سے ہم آہنگی اختیار کرتے ہوئے رہے۔ اس میں کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ قرآنِ پاک اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا کلام ہے...... رب العالمین کا کلام کہ جو کائنات کا خالق ومالک بھی ہے اور اسے چلا بھی رہا ہے۔

اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا وہی پیغام ہے جس کی تبلیغ حضرت آدم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائے کرام نے کی۔

قرآن اور جدید سائنس کے موضوع پر کثیر تفصیلی علمی مواد قلم بند کیا جا چکا ہے اور اس میدان میں تحقیق ہمہ وقت جاری ہے۔ ان شاء اللہ یہ تحقیق بھی نوعِ انسانی کو اللہ تعالیٰ کے کلام سے قریب لانے میں معاون ثابت ہوگی۔ اس مختصر سی کتاب میں قرآن پاک کے پیش کردہ صرف چند سائنسی حقائق جمع کیے گئے ہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ میں نے اس موضوع کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔

پروفیسر تیجاسان نے قرآن پاک میں بیان کی گئی صرف ایک سائنسی نشانی کی مضبوطی کے باعث اسلام قبول کیا۔ بہت ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو دس اور بعض کو ۱۰۰ سائنسی نشانیوں کی ضرورت ہو، تاکہ وہ قرآن کے من جانب اللہ ہونے کو تسلیم کرسکیں، کچھ لوگ شاید ایسے بھی ہوں جو ہزار نشانیاں دیکھ لینے کے باوجود بھی سچائی کو قبول کرنا نہ چاہتے ہوں۔ قرآن پاک نے اس تنگ نظری کی درج ذیل آیتِ مبارکہ میں مذمت فرمائی ہے:

﴿ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴾ (القرآن: سورۃ ۲، آیت ۱۸)

"بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، یہ اب نہ پلٹیں گے۔"

قرآن پاک انفرادی زندگی اور اجتماعی معاشرت، سب ہی کے لیے مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ الحمد للہ قرآن پاک ہمیں زندگی گزارنے کا جو طریقہ بتاتا ہے وہ ان تمام ''ازموں'' سے بالاتر ہے جو جدید انسان نے محض اپنی کم فہمی اور لاعلمی کی بنا پر ایجاد کیے ہیں کیا یہ ممکن ہے کہ خود خالق سے بہتر کوئی اور رہنمائی دے سکے؟ میری دعا ہے کہ اللہ تعالی اس عاجزانہ کوشش کو قبول فرمائے ہم پر رحم فرمائے اور ہمیں صحیح راستہ دکھائے۔ (آمین)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا قرآن کلامِ خداوندی ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم

سید امتیاز احمد

دارُ النّوادر

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

۱۴۲۸ھ ۲۰۰۷ء

کتاب : کیا قرآن کلام خداوندی ہے؟

مصنف : ڈاکٹر ذاکر نائیک

مترجم : سید امتیاز احمد

اہتمام : دارالنوادر، لاہور

مطبع : موٹروے پریس، لاہور

قیمت : ۵۰ روپے

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے

پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ

اُردو بازار، لاہور فون: 7320318 فیکس: 7239884

ای میل: hikmat100@hotmail.com

فضلی بک

فضلی بک سپر مارکیٹ

اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔

فون: 2212991-2629724

ترتیب

حصہ اوّل

حصہ دوم

☆......☆......☆

خطاب

ڈاکٹر ذاکر نائیک

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

محترم مہمانِ خصوصی جناب رفیق داد صاحب، دیگر مہمانانِ گرامی قدر، محترم بزرگو بھائیو اور بہنو! میں آپ سب کو اسلامی طریقہ سے خوش آمدید کہتا ہوں۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ہماری آج کی گفتگو کا موضوع ہے:

''کیا قرآن کلامِ الٰہی ہے؟''

بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ حضرت محمد ﷺ مذہب اسلام کے بانی تھے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام تو اس وقت سے موجود ہے جب پہلے انسان نے کرۂ ارض پر قدم رکھا تھا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے زمین پر متعدد انبیائے کرام بھیجے اور ان کے ذریعے اپنا پیغام وحی کی صورت میں ہم تک پہنچایا۔ تمام گزشتہ انبیائے کرام کسی خاص قوم یا علاقے کے لیے مبعوث کیے گئے تھے اور ان کا پیغام زمانی لحاظ سے بھی ایک خاص عرصے کے لیے تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ان انبیائے کرام کو معجزات عطا کیے گئے، مثال کے طور پر سمندر میں راستہ بن جانا یا مردے کو زندہ کر دینا، ان معجزات کی نوعیت بھی ایسی ہے کہ یہ اس دور کے لوگوں کے لیے تو دلیل بن سکتے ہیں لیکن آج یہ ممکن نہیں کہ ان معجزات کی جانچ پرکھ کر کے

انھیں ثابت کیا جا سکے۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے آخری پیغمبر تھے۔ جنھیں پوری بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے مبعوث کیا گیا تھا۔ ان کی نبوت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تھی۔ قرآنِ مجید کی سورۂ انبیاء میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمَآ أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ [الانبیاء: ۱۰۷]

''اے نبیؐ! ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

چونکہ حضرت محمد ﷺ اللہ تبارک وتعالیٰ کے آخری پیغام بر تھے اور چونکہ ان کا پیغام پوری انسانیت کے لیے اور ہر زمانے کے لیے تھا، لہٰذا انھیں معجزہ بھی وہ عطا کیا جانا چاہیے تھا جو ہمیشہ باقی رہنے والا اور ہر زمانے کے لیے ہو۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اپنے معجزات پر زور نہیں دیا۔ حالانکہ ان سے بہت سے معجزات کا صدور ہوا جن کی تفصیل احادیث میں موجود ہے۔ ہم مسلمان ان معجزات پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ہم ایک ہی معجزے کو فخریہ بیان کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو قرآن کی صورت میں عطا فرمایا تھا۔ یہ ایک مستقل معجزہ ہے۔ چودہ سو سال سے اس کا اعجاز جاری وساری ہے۔ آج بھی یہ معجزہ ہمارے سامنے ہے، آج بھی اسے پرکھا جا سکتا ہے، اور آئندہ بھی۔

ایک بات جس پر مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہی متفق ہیں وہ یہ ہے کہ قرآنِ مجید کو ایک محمد بن عبداللہ ﷺ نامی شخص نے ساتویں صدی عیسوی میں پہلی بار مکہ نام کے شہر میں بیان کیا تھا۔

قرآنِ مجید کا ذریعہ اور منبع کیا ہے؟ اس بارے میں بنیادی طور پر تین نظریات پائے جاتے ہیں۔

- پہلا نظریہ یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ قرآن کے مصنف ہیں اور قرآن شعوری یا لاشعوری طور پر ان کی اپنی ہی تصنیف ہے۔
- دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے قرآن دوسرے انسانی ذرائع کی مدد

سے یا دیگر مذہبی متون کی مدد سے تحریر کیا ہے۔

- تیسرا ممکنہ نظریہ یہ ہے کہ قرآن انسانی تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ وحی کی صورت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

آیئے ہم ان تینوں نظریات کا تجزیہ کرتے ہیں۔

پہلا ممکنہ مفروضہ یہ ہے کہ قرآن شعوری، لاشعوری یا تحت الشعوری طور پر خود نبی اکرمﷺ کی تصنیف ہے اور انھوں نے خود یہ کتاب تحریر کی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بڑے اور عظیم الشان کام کی تخلیق سے دستبردار ہوتا ہے تو اس کے اس دعوے کو جھٹلانا ویسے ہی ایک غیر منطقی بات بن جاتی ہے، لیکن مستشرقین بالعموم قرآن کے حوالے سے بات کرتے ہوئے یہی کرتے ہیں۔ وہ قرآن کی اصل پر شکوک کا اظہار کرتے ہوئے یہی دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہی قرآن کے مصنف ہیں۔

حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے کبھی ایسا کوئی دعویٰ نہیں فرمایا۔ انھوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ قرآن وحی خداوندی ہے، منزل من اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے برعکس دعویٰ کرنا ایک غیر منطقی بات ہے اور دراصل یہ کہنا ہے کہ (نعوذ باللہ من ذالک) رسول اللہ ﷺ سچ نہیں بول رہے تھے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری حیاتِ طیبہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ نبوت سے پہلے ان کی زندگی چالیس برس کے عرصے پر محیط ہے۔ اور اس پورے عرصے کے دوران انھیں ایک متقی، پرہیز گار، شریف اور باکردار شخصیت تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اہل مکہ انھیں صادق اور امین کے القاب سے پکارا کرتے تھے، دوست دشمن سب ان کی سچائی اور امانت داری پر متفق تھے۔

حتیٰ کہ وہ لوگ، جنھوں نے ان کے دعوئ نبوت کو تسلیم نہیں کیا تھا وہ بھی اپنی امانتیں انھی کے پاس رکھوایا کرتے تھے۔ نبوت کے اعلان کے بعد بھی آپ ﷺ کی امانت داری پر ان کا اعتماد اسی طرح برقرار تھا۔

اس صورت میں یہ ممکن ہی کس طرح ہے کہ اس قدر ایمان دار اور سچا شخص ایک جھوٹا دعویٰ کرے (نعوذ باللہ) اور کہے کہ وہ پیغمبر ہے، اس پر وحی نازل ہوتی ہے، حالانکہ دراصل ایسا نہ ہو۔ بھلا وہ ایسا کیوں کر کریں گے۔

کچھ مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے ایسا مادی فوائد کے حصول کے لیے کیا تھا۔ دنیاوی مفادات حاصل کرنے کے لیے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ (نعوذ باللہ) یقیناً کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو دولت اور مفادات کے حصول کی خاطر نبوت یا ولایت کا جھوٹا دعویٰ کرسکتے ہیں۔ ایسے لوگ نہایت پر تعیش زندگی گزارتے ہیں۔ ایسی مثالیں دنیا بھر میں موجود ہیں۔ خصوصاً ہمارے ملک انڈیا میں تو ایسی مثالیں بہت ہی زیادہ ہیں۔

لیکن حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اعلانِ نبوت سے قبل ایک نسبتاً بہتر معاشی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا نکاح ایک امیر کاروباری خاتون حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا۔ نکاح کے وقت آپ ﷺ کی عمر صرف ۲۵ برس تھی۔ یعنی اعلانِ نبوت سے پندرہ سال پہلے۔

اعلانِ نبوت کے بعد آپ ﷺ کے معاشی حالات کبھی قابل رشک نہیں رہے۔

امام النووی رحمہ اللہ کی کتاب ریاض الصالحین کی حدیث نمبر ۴۹۲ میں کہا گیا ہے:

"امّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ دو دو ماہ تک ہمارے چولہے میں آگ نہیں جلتی تھی۔"

یعنی دو دو ماہ تک حضرت نبی کریم ﷺ اور آپؐ کے اہل خانہ پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے تھے اور صرف پانی اور کھجوروں پر گزارا فرمایا کرتے تھے یا بعض اوقات بکری کا دودھ جو اہل مدینہ پیش کردیا کرتے تھے، اس سے گزر اوقات ہوتی تھی۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی محدود اور عارضی وقفے کے دوران ایسا ہوا ہو۔ بلکہ حضرتِ محمد ﷺ کا طرزِ زندگی ہی ایسا تھا۔ ریاض الصالحین کی ایک اور حدیث ہے:

" حضرت بلال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کو تحائف

وصول ہوتے تو آپؐ فوراً انھیں غریبوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم فرما دیا کرتے تھے، کبھی اپنے لیے کچھ بچا کر نہیں رکھتے تھے۔"

اس صورتِ حال میں نبی کریم ﷺ کے حوالے سے یہ کس طرح سوچا جا سکتا ہے کہ "نعوذ باللہ" آپ ﷺ نے مادی فواید حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بولا ہوگا۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝ ﴾ [البقرۃ: ۷۹]

"پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں، پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔ ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجب ہلاکت۔"

یہ آیت انھی لوگوں کے بارے میں ہے جو اپنے ہاتھوں سے لکھ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دراصل یہ بات وحی الٰہی ہے۔ یا وہ وحی خداوندی میں کسی طرح کی تبدیلی کرتے ہیں۔

اگر اس بات کا ذرا سا بھی امکان ہوتا کہ قرآن نبی کریم ﷺ کی تحریر ہے، یا اس میں نبی کریم ﷺ نے کوئی بھی تبدیلی کی ہے (نعوذ باللہ) تو کیا یہ آیت قرآن میں موجود ہوتی؟ ہرگز نہیں، کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہوتا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ خود اپنے آپ کو برا کہہ رہے ہوں۔

کچھ لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے نبوت کا دعویٰ، شان و شوکت اور جاہ وحکومت کے لیے کیا تھا۔

لیکن وہ لوگ جنھیں جاہ وحشمت، شان وشوکت اور قوت ودولت کی خواہش ہوتی ہے، ان کی زندگیاں کس طرح کی ہوتی ہیں؟ وہ لوگ عالیشان محلوں میں رہتے ہیں، زرق برق

لباس زیب تن کرتے ہیں۔ ان کے اردگرد دربان ہوتے ہیں۔ نوکر چاکر ہوتے ہیں۔

اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی بھی ہمارے سامنے ہے کہ وہ اپنی بکری کا دودھ بھی خود دوہتے تھے۔ اپنے کپڑے خود سی لیا کرتے تھے۔ اپنی جوتی کو خود پیوند لگالیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ گھر کے دیگر کام بھی خود فرمالیا کرتے تھے۔ ان کا طرزِ زیست سادگی اور انکسار کا ایک حیرت انگیز نمونہ تھا۔

آپ ﷺ زمین پر تشریف فرما ہوتے تھے۔ بغیر محافظوں کے رہتے۔ تنہا بازار میں خریداری کے لیے چلے جاتے۔ اگر کوئی غریب ترین شخص بھی آپؐ کو مدعو کرتا تو آپؐ اس کی دعوت ردّ نہ فرماتے اور جو کچھ بھی دعوت میں موجود ہوتا برضا و رغبت تناول فرماتے۔ یہاں تک کہ خود قرآن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ ﴾ [التوبة: ٦١]

''ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو اپنی باتوں سے نبی ﷺ کو دکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص کانوں کا کچا ہے۔ کہو، وہ تمہاری بھلائی کے لیے ایسا ہے۔ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان پر اعتماد کرتا ہے اور سراسر رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو تم میں سے ایمان دار ہیں۔ اور جو لوگ اللہ کے رسولؐ کو دکھ دیتے ہیں، ان کے لیے دردناک سزا ہے۔''

ایک دفعہ کفار کی جانب سے عتبہ نامی ایک سردار نمائندہ بن کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ ''اگر تم نے نبوت کا دعویٰ دولت کے لیے کیا ہے تو ہم تمہارے قدموں میں دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں، اگر حکومت کے لیے کیا ہے تو ہم تمھیں عربوں کا بادشاہ بنا لیتے ہیں، مگر بات یہ ہے کہ تم پیغام توحید سے دستبردار ہو جاؤ۔'' لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات ماننے سے انکار فرما دیا۔

اسی طرح ایک دفعہ خود رسول اللہ ﷺ کے چچا ابو طالب نے بھی کوشش کی کہ آپؐ اپنا پیغام پھیلانے سے باز آ جائیں لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے جواب دیا:

''اے چچا، اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ دیں، پھر بھی میں یہ جدوجہد نہیں چھوڑوں گا، یہاں تک کہ مجھے موت آ جائے۔''

ایک ایسے شخص کو اس قدر تکلیف اور قربانی والی زندگی گزارنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ چاہتے تو اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتے تھے۔

مزید برآں، آپؐ کی شخصیت میں اس قدر انکسار اور شرافت تھی کہ آپ ﷺ نے اپنی ہر کامیابی کے موقع پر یہی ارشاد فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، میری ذاتی صلاحیت کی وجہ سے نہیں ہے۔

بعض مستشرقین نے ایک نیا مفروضہ پیش کر دیا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ دراصل (نعوذ باللہ) ایک دماغی عارضے میں مبتلا تھے۔ اس عارضے کو (Mythomania) کہتے ہیں اور اس میں مبتلا شخص جھوٹ بولتا ہے، لیکن اسے خود اپنے جھوٹ پر پورا یقین ہوتا ہے۔ لہٰذا ان مستشرقین کا کہنا (نعوذ باللہ) یہ ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ جھوٹ بولتے تھے لیکن انھیں خود اس پر پورا یقین ہوتا تھا۔

اگر ایک ماہر نفسیات نے Mythomania میں مبتلا مریض کا علاج کرنا ہو تو وہ کیا کرے گا؟ اسے صرف اتنا کرنا ہوگا کہ مریض کو حقایق کا سامنا کرنے پر مجبور کر دے۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ وہ شاہِ انگلستان ہے۔ معالج اسے یہ نہیں کہے گا کہ تم دیوانے ہو چکے ہو بلکہ وہ اس سے سوال کرے گا کہ اچھا اگر تم شاہِ انگلستان ہو تو بتاؤ تمھاری ملکہ کہاں ہے؟ تمہارے وزراء اور درباری کہاں ہیں؟ دربان اور محافظ کہاں ہیں؟ معالج جب حقایق اس کے سامنے لاتا جائے گا تو بالآخر Mythomania کا مریض خود ہی کہہ دے گا کہ ''میرا خیال ہے کہ میں شاہِ انگلستان نہیں ہوں۔''

یہی کام قرآن کرتا ہے، قرآن لوگوں کے سامنے حقایق رکھتا ہے پھر ان سے سوالات کرتا ہے۔ یعنی درحقیقت پیغمبر اسلام ﷺ (نعوذ باللہ) Mythomaniac نہیں تھے بلکہ درحقیقت پیغمبر ﷺ کا انکار کرنے والے اس عارضے میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ وہ پیغمبر ﷺ کی دعوت کا انکار کر رہے ہیں اور اپنے اس غلط موقف پر یقین بھی رکھتے ہیں۔ قرآن ان لوگوں کے سامنے سوالات رکھتا ہے کہ اگر تمھیں شک ہے، اگر تم اسے حق نہیں سمجھتے تو پھر ایسا کرو...... اور ایسا کرو، یا اگر قرآن اللہ کی جانب سے نہ ہوتا پھر یوں ہوتا۔ قرآن ایسے متعدد سوالات کرتا ہے، جن کے بارے میں ہم ان شاء اللہ آگے گفتگو کریں گے۔

کچھ لوگوں کا نظریہ ہے کہ قرآن دراصل ایک مذہبی واہمہ ہے یا لاشعوری خیالات کا مجموعہ ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) رسول اللہ ﷺ، غیر شعوری طور پر اپنے خیالات قرآن کی صورت میں پیش کر دیتے تھے۔ یہ لوگ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا ذہنی توازن ہی درست نہیں تھا۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

یہ لوگ ایک بنیادی حقیقت نظر انداز کر دیتے ہیں اور وہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن ایک ہی بار نازل نہیں ہوا تھا۔ قرآن کا عرصۂ نزول ۲۳ برس کے طویل عرصے پر مشتمل ہے۔ اگر قرآن رسول اللہ ﷺ نے ایک ہی بار پیش کیا ہوتا تو ان معترضین کو یہ بات کرنے کا موقع مل بھی سکتا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن کا نزول ۲۳ سال کے عرصے میں بہ تدریج ہوا تھا۔ اگر یہ لاشعوری خیالات کا مجموعہ ہوتا تو اس میں یکسانیت اور روانی کا ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ اگر ان لوگوں کے دعوے کے مطابق قرآنِ حکیم آنحضرتؐ کے تحت الشعوری خیالات اور آپؐ کے ابنارمل دماغ کا نتیجۂ فکر ہوتا (نعوذ باللہ) تو اس میں تضاد موجود ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ ۲۳ سال تک مسلسل ایک بات کرنا، ایک دعویٰ کرنا اور اس پر مسلسل قایم رہنا ممکن ہی نہیں ہے، اگر یہ دعویٰ محض لاشعوری خیالات کا نتیجہ ہوتا۔ قرآن خود ایسے کسی دعوے کی تردید کے لیے کافی ثبوت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن متعدد تاریخی واقعات کا حوالہ دیتا ہے جو اُس وقت کسی کے علم میں نہیں تھے لیکن درست ثابت ہوئے۔

اسی طرح قرآنِ مجید متعدد پیش گوئیاں بھی کرتا ہے اور یہ تمام پیش گوئیاں حرف بہ حرف پوری ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایسے متعدد سائنسی حقایق کا ذکر قرآنِ مجید میں موجود ہے جو اُس وقت لوگوں کے علم میں ہی نہیں تھے لیکن آج ان کی تصدیق ہوچکی ہے۔ اور یہ ممکن ہی نہیں کہ لاشعوری خیالات کی مدد سے اس قسم کی پیش گوئیاں کی جاسکیں۔

خود قرآن اس بات کی گواہی سورۂ اعراف میں اس طرح دیتا ہے:

﴿ أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِهِم مِّن جِنَّةٍ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴾

[الاعراف: ١٨٤]

''اور کیا ان لوگوں نے کبھی سوچا نہیں؟ ان کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ تو ایک خبردار کرنے والا ہے جو (بُرا انجام سامنے آنے سے پہلے) صاف صاف متنبہ کر رہا ہے۔''

اسی طرح سورۃ القلم میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ مَا أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ﴾ [القلم: ٢]

''تم اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہو۔''

مزید فرمایا گیا:

﴿ وَمَا صَاحِبُكُم بِمَجْنُونٍ ﴾ [التكوير: ٢٢]

''اور (اے اہل مکہ) تمھارا رفیق مجنون نہیں ہے۔''

لہٰذا کوئی شخص جھوٹ کس طرح بولے گا؟

یہاں تمام نظریات کا ذکر کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن وقفۂ سوالات کے دوران آپ سوالات کر سکتے ہیں اور ان شاء اللہ میں جواب دینے کی پوری کوشش کروں گا۔

دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے قرآن دیگر مذہبی کتابوں کی مدد سے یا انسانی ذرائع کی مدد سے تحریر کیا۔ (نعوذ باللہ) اس نظریے کو غلط ثابت کرنے کے لیے تو ایک تاریخی حقیقت پیش کر دینا ہی کافی ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے محبوب پیغمبر حضرت

محمد مصطفیٰ ﷺ پڑھنا لکھنا جانتے ہی نہیں تھے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴾ [العنکبوت: ٤٨]

''(اے نبی ﷺ!) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔''

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے علم میں تھا کہ لوگ قرآن کے بارے میں شک کریں گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ربِّ حکیم نے اپنی حکمت کاملہ سے کام لیتے ہوئے اپنے آخری پیغمبر ﷺ کو اُمّی یعنی رسمی تعلیم سے ناآشنا ہونے کی حیثیت سے مبعوث فرمایا۔

بصورتِ دیگر یہ بات ضرور کی جاتی، باطل پرست لوگ، غیر سنجیدہ لوگ ایسی باتیں ضرور کرتے یا انھیں ایسی باتیں کرنے کا موقع ضرور مل جاتا۔ اگر رسول اللہ ﷺ، تعلیم یافتہ ہوتے تو منفی ذہنیت رکھنے والے لوگ ضرور یہ دعویٰ کرنے کی کوشش کرتے کہ (نعوذ باللہ) آپ ﷺ نے کسی انسانی ذریعہ سے یہ معلومات حاصل کر کے قرآن کی صورت میں پیش کر دی ہیں۔

لیکن الحمدللہ ان معترضین کے پاس ایسی کوئی گنجائش نہیں۔ اس مفروضے کی حیثیت پرکاہ کے برابر بھی نہیں ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ سجدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ الٓمّٓ ○ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ○ ﴾ [السجدہ: ٣۔١]

''ا۔ ل۔ م۔ اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ ربّ العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے

رب کی طرف سے تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں۔"

قرآن کا اسلوب بیان دوسرے مذہبی صحیفوں کے متن سے بالکل مختلف ہے۔ دیگر مذہبی کتابیں بالعموم داستانی انداز لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ کسی انسان کی تحریر کردہ داستان کا طرزِ آغاز کیا ہوتا ہے؟ بالعموم یہ اس طرح شروع ہوتی ہیں۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے............................"

اسی طرح اگر آپ دیگر مذہبی متون کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان کا آغاز بھی کچھ اسی طرح ہوتا ہے۔

"سب سے پہلے خدا تھا، اس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا............................"

یا یہ کہ:

"سب سے پہلے لفظ تھا............................"

لیکن قرآن کا اسلوب اس انسانی اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔ اسی طرح اگر آپ دیگر مذہبی کتابوں کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں ایک خاص ترتیب سے واقعات بیان کیے جاتے ہیں، اگر کسی شخص کا ذکر ہے تو اس کے خاندان کا ذکر ہوگا، اس کی اولاد کا بیان ہوگا اور اسی طرح بالترتیب واقعات بیان ہوتے چلے جائیں گے۔ پہلا باب پھر دوسرا باب، اسی طرح آخر تک ترتیب ہوگی۔

قرآن بھی لوگوں کے بارے میں، ان کے خاندانوں کے بارے میں بات کرتا ہے لیکن قرآنی اسلوب، انسانی اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔ کسی انسان کی لکھی ہوئی کہانیوں کی کتاب سے بالکل مختلف ہے۔ قرآن اپنا ایک منفرد اسلوبِ بیان رکھتا ہے۔ یہ ایک منفرد کتاب ہے۔

جب لوگ قرآن کو انسانی تحریر ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو پھر ایک نیا دعویٰ لے کر سامنے آجاتے ہیں کہ یہ دھوکہ ہے۔ انھیں اپنی بات ثابت کرنے کے لیے کوئی ایک

معمولی سا ثبوت بھی نہیں ملتا۔ مگر یہ لوگ پھر بھی اپنی بات پر اڑے رہتے ہیں اور خود کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں۔

ان لوگوں کی مثال کچھ اس طرح ہے کہ فرض کیجیے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ فلاں شخص میرا دشمن ہے۔ میرے پاس بات کے لیے کوئی ثبوت یا شہادت بھی نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے اس بات پر پورا یقین ہے، لہٰذا جب بھی وہ شخص میرے سامنے آتا ہے میں اس کے ساتھ دشمنوں والا رویہ ہی اختیار کرتا ہوں۔ جوابی طور پر اس کا رویہ بھی میرے ساتھ خراب ہو جاتا ہے، بالآخر وہ بھی مجھ سے دشمنوں کی طرح پیش آنے لگتا ہے اور پھر میں کہتا ہوں:

"دیکھا! میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ یہ شخص میرا دشمن ہے کیوں کہ وہ مجھ سے دشمنوں کی طرح پیش آ رہا ہے۔"

سو ہوتا یہ ہے کہ لوگ ایک غلط بات مان لیتے ہیں اور پھر بیوقوفوں کی طرح اس پر اڑے رہتے ہیں۔ قرآن کا کہنا ہے کہ وحی عقل انسانی کے مطابق ہے لیکن بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ متونِ مقدسہ عقل انسانی سے ماوراء ہیں۔ اگر یہ متونِ مقدسہ واقعی ہماری عقل و فہم سے ماوراء ہیں تو پھر انھیں سمجھنا کیوں کر ممکن ہوگا؟ یہ کس طرح معلوم کیا جا سکے گا کہ کون سا مذہبی متن واقعی وحی خداوندی ہے اور کون سا نہیں؟

قرآن تو خود اپنے قاری کو تفکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن مکالمے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ بہت سے مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ مذہبی مباحث سے بچنا چاہیے اور جہاں معاملہ مذہب کا ہو، کسی مباحثے سے پرہیز ہی بہتر ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کا یہ رویّہ غلط ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ۝ ﴾ [النحل: ۱۲۵]

"(اے نبی ﷺ!) اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو، حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے۔"

چناں چہ ہمیں حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ عربی لفظ ﴿ قالوا ﴾ قرآنِ مجید میں ۳۳۲ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کا مطلب ہے "وہ کہتے ہیں" اور اسی طرح لفظ ﴿ قل ﴾ بھی اتنی ہی مرتبہ یعنی ۳۳۲ مرتبہ قرآن میں آیا ہے، اس لفظ کا مطلب ہے "کہو"۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مکالمے اور مباحثے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

ایک نظریہ ہے جسے "Exhausting the alternatives" کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی دعوے کے متبادل تمام دعوے ختم کر دینا، متبادل صورتیں ردّ کر دینا، اس طرح اصل دعویٰ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ کلامِ خداوندی ہے، اگر تم یہ بات تسلیم نہیں کرتے تو بتاؤ یہ کیا ہے؟ آپ متبادل دعویٰ کرتے ہیں، کچھ لوگ کہتے ہیں یہ رسول اللہ ﷺ کی تحریر ہے، قرآن اس بات کو غلط ثابت کر دیتا ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ ﷺ نے مادی مفادات کے لیے قرآن پیش کیا تھا اور یہ دعویٰ بھی بالکل غلط ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح مختلف متبادل صورتیں پیش ہوتی اور ردّ ہوتی چلی جاتی ہیں اور تمام متبادل دعوے ردّ ہونے کے بعد اس سوال کا ایک ہی جواب باقی رہ جاتا ہے کہ یہ کتاب منزل من اللہ ہے، کلامِ خداوندی ہے کیوں کہ اگر ایسا نہیں تو پھر یہ کیا ہے؟

سورۂ جاثیہ میں فرمایا گیا:

﴿ حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ ﴾

[الجاثیہ: ۲۔۱]

"ح۔م۔ اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔"

یہ بات قرآنِ مجید میں بہت سے مقامات پر کی گئی ہے کہ قرآن کلامِ خداوندی ہے۔

یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ [الانعام: ۱۹]

''اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تا کہ تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے، سب کو متنبہ کردوں۔''

﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ﴾ [یوسف: ۱۰۲]

''اے نبیؐ! یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں۔''

﴿ طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ ﴾

[طٰہٰ: ۱۔۳]

''طٰہٰ۔ ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہ تو ایک یاد دہانی ہے ہر اس شخص کے لیے جو ڈرے۔''

﴿ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ ۝ ﴾ [النمل: ٦]

''بلاشبہ تم یہ قرآن ایک حکیم و علیم ہستی کی طرف سے پا رہے ہو۔''

سورۂ سجدہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ ﴾ [السجدہ: ۱۔۳]

''ا۔ل۔م۔ اس کتاب کی تنزیل بلاشبہ ربّ العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے تا کہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں۔''

اسی طرح سورۂ یٰسین میں فرمایا گیا:

﴿ يٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ عَلٰى صِرَاطٍ

مُّسْتَقِيْمٍ ۝ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ ﴾ [یٰسٓ : ۵-۱]

''یٰسٓ۔ قسم ہے قرآنِ حکیم کی کہ تم یقیناً رسولوں میں سے ہو، سیدھے راستے پر ہو (اور یہ قرآن) غالب اور رحیم ہستی کا نازل کردہ ہے۔''

﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ ﴾ [الزمر : ۱]

''اس کتاب کا نزول، اللہ زبردست اور دانا کی طرف سے ہے۔''

﴿ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ ﴾ [الجاثیہ : ۲]

''اس کتاب کا نزول، اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔''

﴿ اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ ﴾ [الرحمٰن : ۲-۱]

''نہایت مہربان (خدا) نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔''

﴿ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ [الواقعہ : ۸۰-۷۷]

''یہ بلند پایہ قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں ثبت، جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے۔''

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ۝ ﴾ [الدھر : ۲۳]

''(اے نبیؐ!) ہم نے ہی یہ قرآن تم پر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے۔''

اسی طرح متعدد دیگر مقامات پر بھی یہ ارشاد ہوا ہے کہ قرآن دراصل اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر بتاؤ یہ کیا ہے؟

سائنسی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو سائنس کی دنیا کا ایک اپنا طریقہ کار ہے۔ کسی نئے نظریے کے بارے میں ان کا رویہ یہ ہوگا کہ اگر اس کا کوئی تردیدی امتحان نہیں ہوسکتا تو وہ اس نظریے پر توجہ ہی نہیں دیں گے۔

تفصیل میں جانے کا وقت میرے پاس نہیں ہے۔ مختصراً سمجھ لیجیے کہ یہ نظریہ تردیدیت (Falsification) کہلاتا ہے۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ اگر آپ نئے نظریے کا Filsifi-

cation test۔ نہیں کر سکتے تو پھر ہمارا وقت ضائع نہ کریں۔

یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں جب آئن سٹائن نے ایک نیا نظریہ پیش کیا تو ساتھ ہی اس نے تین Falsification Test بھی پیش کر دیے کہ اگر میرا نظریہ درست نہیں ہے تو ان تین طریقوں سے ان نظریے کو غلط ثابت کر دیا جائے، یعنی یہ تین امتحان ایسے ہیں جن سے نظریے کے درست یا غلط ہونے کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

اور سائنسدانوں نے چھ برس تک غور و فکر کرنے کے بعد تسلیم کیا کہ ہاں البرٹ آئن سٹائن کا نظریہ درست ہے۔ اس طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کوئی عظیم شخصیت ہے لیکن یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ نظریہ قابل غور اور قابل توجہ ہے۔

قرآن کے معاملے میں ایسے متعدد ''تردیدی امتحان'' (Falsification Test) موجود ہیں۔ اگر آئندہ آپ کی کسی سے مذہب کے بارے میں گفتگو ہو تو ایک سوال ضرور کریں کہ '' کیا اُس کے پاس کوئی ایسا امتحان ہے جس کی مدد سے اس کے مذہب کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہو؟''

یقین کیجیے میں نے متعدد لوگوں سے یہ سوال کیا ہے اور آج تک کسی نے یہ جواب نہیں دیا کہ ہاں میرے پاس اپنے مذہب کو غلط ثابت کرنے کے لیے کوئی امتحان موجود ہے۔

لیکن قرآن کا معاملہ مختلف ہے۔ قرآن ایسے متعدد پیمانے، ایسے تردیدی امتحان پیش کرتا ہے۔ ان میں سے کچھ تو صرف ماضی کے لیے تھے جب کہ کچھ ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہیں۔

میں آپ کے سامنے چند مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔

رسول اللہ ﷺ کے ایک چچا کا نام ابولہب تھا۔ اس کا شمار پیغمبر اسلام ﷺ کے شدید ترین مخالفین میں ہوتا تھا۔ اس کی عادت یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا تعاقب کرتا، اور جب بھی رسول اللہ ﷺ کو کسی اجنبی سے بات کرتے دیکھتا تو ان کے جانے کے بعد فوراً اس سے پوچھتا کہ محمد بن عبداللہ ﷺ نے تم سے کیا بات کی ہے؟ اور اس کے الٹ باتیں

کرتا۔ اگر رسول اللہ ﷺ نے کہا ہوتا کہ دن ہے تو یہ کہتا کہ رات ہے۔ یعنی ہر بات کی مخالفت کرتا۔

قرآنِ مجید میں سورۃ لہب نام کی ایک پوری سورۃ موجود ہے۔ اس سورۃ میں فرمایا گیا ہے کہ ابولہب اور اس کی بیوی کو ان کے اعمال کے سبب جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا۔ گویا بالواسطہ طور پر یہ کہہ دیا گیا ہے کہ وہ کبھی مسلمان نہیں ہوگا، کافر ہی رہے گا۔

یہ سورۃ ابولہب کی موت سے کوئی دس برس پہلے نازل ہوئی تھی۔ یعنی اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد دس سال تک ابولہب زندہ رہا۔ اس عرصے میں ابولہب کے دوستوں میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے، جو خود بھی اس کی طرح اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے مخالف تھے۔

چوں کہ ابولہب رسول اللہ ﷺ کی ہر بات کی مخالفت کرتا تھا، ہر بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا، لہٰذا اسے صرف اتنا ہی کرنا تھا کہ اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیتا۔ اسے اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کی ضرورت نہ تھی، مسلمانوں والی عادات اپنانا لازم نہ تھا، صرف قبولِ اسلام کا اعلان کر کے وہ رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) غلط ثابت کر سکتا تھا۔ وہ دعویٰ کرتا کہ میں مسلمان ہوں اور قرآن کو غلط قرار دے دیتا۔ یہ کام اس کے لیے انتہائی آسان تھا۔ وہ پہلے بھی کذب بیانی سے کام لیتا تھا۔ ایک اضافی جھوٹ ہی تو بولنا تھا۔

یہ ایسا ہی تھا جیسے رسول اللہ ﷺ اسے خود دعوت دے رہے ہوں کہ تم میرے دشمن ہو، مجھے غلط ثابت کرنا چاہتے ہو تو آؤ! اسلام قبول کرنے کا اعلان کرو اور مجھے غلط ثابت کر دو!

یہ کام انتہائی آسان تھا لیکن وہ نہیں کر پایا۔ یہ بات واضح ہے کہ کوئی انسان اپنی کتاب میں ایسا دعویٰ کرنے کی، ایسا بیان دینے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہ یقیناً کلامِ خداوندی ہی ہے۔

اسی طرح ایک اور مثال سورۂ بقرہ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ ٥ ﴾ [البقرۃ: ۹۵-۹۴]

''ان سے کہو کہ اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے لیے ہی مخصوص ہے، تب تو تمھیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو، اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو، یقین جانو کہ یہ کبھی اس کی تمنا نہیں کریں گے، اس لیے کہ اپنے ہاتھوں سے انھوں نے جو کچھ کما کر وہاں بھیجا ہے، اس کا اقتضا یہی ہے (کہ یہ وہاں جانے کی تمنا نہ کریں) اللہ ان ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے۔''

مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ایک گفتگو کے درمیان میں یہودیوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ آخرت کا گھر یعنی جنت صرف انھی کے لیے ہے، کسی اور کے لیے نہیں، اس کے بعد مذکورہ آیت نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا کہ اگر واقعی جنت صرف یہودیوں کے لیے مخصوص ہے اور وہی جنت میں جائیں گے تو پھر تمھیں چاہیے کہ موت کی تمنا کرو، مرنے کی خواہش کرو۔

اس موقع پر صرف اتنا ہی کرنا تھا کہ یہودیوں میں سے ایک شخص سامنے آتا اور کہتا کہ ہاں میں مرنے کی تمنا رکھتا ہوں۔ صرف دعویٰ ہی تو کرنا تھا۔ واقعی مرنا ضروری نہیں تھا صرف زبانی کہنا تھا کہ میں مرنا چاہتا ہوں اور وہ قرآنی بیان کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ لیکن کوئی یہودی آگے نہیں بڑھا، کسی نے یہ بیان نہیں دیا کہ ہاں میں موت کی تمنا رکھتا ہوں۔

یہ بڑا واضح تردیدی امتحان Falsification Test تھا جو قرآن نے پیش کیا۔

لیکن ہوسکتا ہے آپ مجھ سے کہیں کہ یہ تمام باتیں ماضی کی ہیں، یہ امتحان لینا تو ماضی میں ہی ممکن تھا۔ کیا آج کے لیے بھی کوئی ایسا امتحان موجود ہے جس کی مدد سے قرآن کو (معاذ اللہ) غلط ثابت کیا جا سکے۔

یقیناً ایسے Falsification Test بھی ہیں جو ہر دور اور ہر زمانے کے لیے ہیں جو آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے کے لیے بھی تھے، آج کے لیے بھی کارآمد ہیں اور آنے والے زمانوں میں بھی رہیں گے۔ مثال کے طور پر، بہت سے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن کلامِ خداوندی نہیں ہے۔ قرآن ایسے لوگوں کے بارے میں کہتا ہے:

﴿ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۝ ﴾

[بنی اسرائیل : ۸۸]

"کہہ دو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لاسکیں گے، چاہے وہ سب کے سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔"

اس آیت کریمہ میں ایک چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر پوری بنی نوعِ انسان اور سارے جنات مل کر قرآن جیسی ایک کتاب بنانا چاہیں تو وہ کامیاب نہیں ہوسکتے، خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن کا معاملہ یہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن روئے زمین پر عربی زبان وادب کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

قرآنی عربی اس قدر واضح، قابل فہم، معجزاتی اور ناقابل تقلید ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اور اس کے باوجود قرآن کا ہر بیان حق اور سچائی کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ زبان و بیان کا اعلیٰ ترین اسلوب ہے جو اس کو وحی خداوندی ثابت کرتا ہے، قرآن کی ہر آیت بیک وقت ایک عام آدمی پر بھی اثر کرتی ہے اور ایک پڑھے لکھے عالم فاضل آدمی کو بھی متاثر کرتی ہے۔ حالاں کہ قرآن شاعری بھی نہیں۔ یہ وزن اور قافیہ ردیف سے

بھی کام نہیں لیتا۔ یہ حقیقی معنوں میں ایک معجزاتی کتاب ہے۔

یہ چیلنج قرآن میں دوبارہ، ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ [الطور: ۳۴-۳۳]

''کیا یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے یہ قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے، اگر یہ اپنے اس قول میں سچے ہیں تو اسی شان کا ایک کلام بنا لائیں۔''

اس آیت کریمہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس امتحان کو لوگوں کے لیے مزید آسان بنا دیا گیا ہے۔ بلکہ سورۂ ھود میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ [ھود: ۱۳]

''کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے؟ کہو، اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اور جو جو (تمھارے معبود) ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم (انھیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو۔''

لیکن ہم جانتے ہیں کہ کوئی بھی یہ چیلنج پورا نہ کر سکا اور قرآن جیسی دس سورتیں بنا کر پیش نہیں کر سکا۔

سورۂ یونس میں یہ امتحان مزید آسان بنا کر پیش کیا گیا۔ وہاں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ [یونس: ۳۸]

''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے خود اسے تصنیف کر لیا ہے؟ کہو، اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور ایک خدا کو چھوڑ کر

جس جس کو بلا سکتے ہو، مدد کے لیے بلا لو۔"

لیکن یہ لوگ اتنا بھی نہیں کر پائے۔ کوئی ایک سورۃ بنا کر نہیں لا سکا۔ اللہ تعالیٰ نے اس Falsification Test کو آسان ترین صورت میں بھی پیش کر دیا۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ [البقرة: ٢٤-٢٣]

"اگر تمھیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں، تو اس کے مانند ایک ہی سورۃ بنا لاؤ، اپنے سارے ہم نواؤں کو بلا لو، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو، مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر کے دکھاؤ۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور یقیناً کبھی نہیں کر سکتے، تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر، جو مہیا کی گئی ہے منکرین حق کے لیے۔"

قرآن نے چیلنج دیا کہ اس جیسی کتاب بنا کر دکھاؤ، پھر آسان کر دیا کہ چلو دس سورتیں ایسی بنا کر لے آؤ، پھر اس چیلنج کو آسان تر بنا کر فرمایا کہ ایک سورۃ بنا کر دکھا دو۔ یہاں آسان ترین معاملہ کر دیا گیا ہے کہ چلو اس سے ملتی جلتی ایک سورۃ ہی بنا لاؤ۔ اس جیسی نہیں اس کے مانند ایک سورۃ ہی لے آؤ۔ دیگر جگہوں پر لفظ ﴿ مِثْلِهٖ ﴾ استعمال ہوا تھا۔ یہاں فرمایا گیا: ﴿ مِنْ مِثْلِهٖ ﴾ یعنی "اس سے ملتی جلتی"۔ لیکن پھر بھی کفارِ عرب بری طرح ناکام ہوئے۔

عربی زبان و ادب، اپنی فصاحت و بلاغت اور ادبیت کے لحاظ سے نزولِ قرآن کے زمانے میں اپنے عروج پر تھے۔ متعدد کفار عرب نے کوشش کی اور بری طرح ناکام رہے۔

اس قسم کی بعض کوششیں تاریخ کی کتابوں میں محفوظ رہ گئیں اور آج بھی لوگ انھیں پڑھ پڑھ کر ہنستے ہیں۔

یہ چیلنج آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے دیا گیا تھا اور آج بھی موجود ہے۔ایک کروڑ چالیس لاکھ قبطی عیسائی موجود ہیں۔ یہ لوگ نسلاً عرب ہیں۔ان کی مادری زبان عربی ہے۔ یہ چیلنج ان کے سامنے بھی موجود ہے۔

اگر وہ بھی چاہتے ہیں کہ قرآن کو غلط ثابت کر دیں (معاذ اللہ) تو انھیں صرف اتنا کرنا ہوگا کہ قرآن جیسی ایک سورۃ بنا کر دکھا دیں۔ اور اگر آپ غور کریں تو صورت یہ ہے کہ قرآن کی بعض سورتیں انتہائی مختصر ہیں اور چند الفاظ پر ہی مشتمل ہیں، لیکن نہ تو آج تک کوئی یہ چیلنج قبول کر سکا ہے اور نہ ہی کبھی آئندہ قبول کر پائے گا۔ان شاء اللہ۔

ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے کوئی یہ کہے کہ عربی میری مادری زبان نہیں ہے، میں یہ زبان جانتا ہی نہیں۔ میں یہ امتحان کیسے دے سکتا ہوں۔

قرآن غیر عربوں کے لیے بھی ایک معیار پیش کر دیتا ہے، دنیا کا کوئی بھی شخص، خوہ وہ عربی نہ جانتا ہو، اس طرح قرآن کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

سورۂ نساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴾ [النساء: ۸۲]

"کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔"

گویا ارشادِ قرآنی یہ ہے کہ اگر قرآن کو غلط ثابت کرنا چاہتے ہو تو صرف اتنا کرو کہ قرآن میں تضاد یا اختلاف بیانی کی کوئی ایک ہی مثال پیش کر دو۔قرآن کی کوئی ایک غلطی، تضاد یا اختلاف دکھا دو اور تم یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے کہ قرآن کلامِ خداوندی نہیں ہے۔انتہائی سیدھی سی بات ہے۔

میں جانتا ہوں کہ سینکڑوں لوگ یہ کوشش کر چکے ہیں۔قرآن میں غلطیوں اور تضادات کی بزعم خویش نشان دہی کر چکے ہیں۔لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ سو فی صد صورتوں میں یا تو غلط بیانی کی گئی ہے، سیاق وسباق سے ہٹ کر بات کی گئی ہے، غلط ترجمہ کیا گیا ہے یا دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔آج تک کوئی بھی شخص قرآن میں کوئی ایک غلطی یا تضاد بھی ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

فرض کیجیے ایک مولانا صاحب ہیں، جو تاریخ اسلام کے بارے میں اچھا علم رکھتے ہیں لیکن جدید سائنس کے بارے میں علم نہیں رکھتے۔ میں بہت سے ایسے علما کو جانتا ہوں جو دینی علوم میں بھی مہارت رکھتے ہیں اور سائنس میں بھی، لیکن میں ایک ایسے عالم کی مثال دے رہا ہوں جو دینی علوم کا تو ماہر ہے لیکن سائنسی علوم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اگر ایسے کسی عالم کے سامنے یہ دعویٰ کر دیا جائے کہ قرآن میں فلاں فلاں سائنسی اغلاط موجود ہیں اور یہ عالم جواب نہ دے پائے، وضاحت نہ کر سکے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن میں واقعی یہ غلطیاں موجود ہیں اور یہ کہ قرآن (نعوذ باللہ) کلامِ خداوندی نہیں ہے۔

کیوں کہ قرآن تو کہتا ہے کہ:

﴿ فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ۝ ﴾ [الفرقان : ٥٩]

''جاننے والے سے پوچھو۔''

اگر آپ قرآن کے کسی سائنسی بیان کو سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی ایسے شخص سے پوچھنا پڑے گا جو سائنس کے بارے میں جانتا ہو۔ اسی صورت میں آپ کو پتہ چل سکے گا کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے۔

اسی طرح فرض کیجیے حاضرین میں سے کوئی قرآن میں (نعوذ باللہ) کسی گرامر کی غلطی کے بارے میں دعویٰ کر دیتا ہے۔ میں عربی زبان کا ماہر نہیں ہوں۔ میں محض ایک طالب علم ہوں۔ اب اگر میں سوال کا جواب دے سکتا ہوں تو الحمد للہ لیکن اگر میں اپنے محدود علم کی وجہ سے، عربی زبان میں مہارت نہ رکھنے کی وجہ سے جواب نہیں دے پاتا تو اس کا مطلب یہ

کچھ خدا کا غلط تصور رکھتے ہیں۔ ایک دہریہ اس تصور کو رد کرتا ہے لیکن میں بحیثیت مسلمان بھی اس غلط تصور کی تائید نہیں کرتا، میں بھی اس غلط تصورِ خدا کو رد کرتا ہوں۔ یہ ''لا الٰہ'' کا مرحلہ ہے۔ لیکن جس وقت میں یہاں تک اس سے اتفاق کرتا ہوں، اس وقت میرا فرض بنتا ہے کہ میں خدا کا صحیح اور درست تصور بھی اس کے سامنے پیش کروں۔ اللہ کے حقیقی تصور سے اسے آگاہ کروں۔

اچھا اب فرض کیجیے کہ ایک شخص غیر مسلم ہے بلکہ اسلام کا مخالف ہے۔ اس سے پوچھا جائے تو وہ کہتا ہے کہ میں اسلام کا اس لیے مخالف ہوں کہ:

یہ ایک ظالمانہ مذہب ہے......

یہ ایک بے رحمانہ مذہب ہے......

یہ مذہب دہشت گردی کی ترویج کرتا ہے......

یہ مذہب خواتین کے حقوق تسلیم نہیں کرتا......

یہ مذہب غیر سائنسی ہے......

اگر وہ مجھے بتاتا ہے کہ مذکورہ اسباب کی وجہ سے وہ اسلام کا مخالف ہے تو میں اس سے کہوں گا کہ جس مذہب کی یہ خصوصیات ہوں میں خود اس کا مخالف ہوں، میں خود کسی ایسے مذہب کو تسلیم نہیں کرتا جو ظالمانہ ہو، جو خواتین کے حقوق غصب کرتا ہو لیکن میں اسے یہ بھی بتاؤں گا کہ یہ خصوصیات اسلام کی نہیں ہیں۔ میں اسلام کا صحیح تصور اس کے سامنے پیش کروں گا، اسے بتاؤں گا کہ اسلام تو رحم پر زور دینے والا مذہب ہے، دہشت گردی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مذہب خواتین کو مساوی حقوق دیتا ہے۔ اسلام اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

اس کے بعد یقیناً وہ غیر مسلم، ان شاء اللہ، اسلام کو تسلیم کرے گا، یہ ہمارا فرض ہے کہ اسلام کا درست تصور لوگوں تک پہنچائیں۔ اسی طرح خدا کا، اللہ تعالیٰ کا درست تصور بھی لوگوں تک پہنچانا ضروری ہے۔

خدا کی، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی، میرے خیال میں بہترین تعریف وہ ہے جو قرآنِ مجید میں بیان کر دی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ ﴾ [الاخلاص: ٤ ـ ١]

''کہو، وہ اللہ ہے، یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔''

مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی میں بتایا گیا ہے کہ:

...... خدا واحد و یکتا ہے، اکیلا ہے۔

...... وہ بے نیاز ہے، ہر کسی کو اس کی ضرورت ہے۔ اسے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔

...... وہ دنیاوی رشتوں سے پاک ہے، نہ اس کے والدین ہیں نہ اولاد۔ وہ ماں باپ اور بچوں جیسے رشتے نہیں رکھتا۔

...... اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے، اس کا تقابل کسی سے نہیں ہوسکتا، اس جیسا کوئی نہیں ہے۔ اگر خدا کا کسی سے تقابل ''Comparison'' کیا جاسکے تو وہ خدا نہیں ہے۔

گویا یہاں اللہ تعالیٰ کی ایک چہار سطری تعریف بیان کر دی گئی ہے۔ اگر کسی کا تصورِ خدا اس تعریف کے مطابق ہے تو ہم مسلمانوں کو اس تصورِ خدا پر کوئی اعتراض نہیں ہے، ہم اسے تسلیم کرتے ہیں۔

اب جو جو خدائی کے امیدوار ہیں، انھیں سامنے آنا ہوگا، انھیں اس امتحان پر پورا اترنا ہوگا۔ خدائی کا امیدوار کون ہے؟ کون خدائی کا دعویٰ کرتا ہے؟

بعض لوگ گرو رجنیش کو، اوشو کو خدا سمجھتے ہیں۔ آیئے ہم اسے اس کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔

خدا کی پہلی صفت، واحد یکتا ہونا ہے۔ کیا بھگوان رجنیش واحد و یکتا تھا؟ نہیں۔ اس جیسے ہزاروں لوگ موجود ہیں۔ ہمارے ملک میں ہی اس جیسے بہت سے لوگ پائے جاتے

ہیں۔لیکن ہوسکتا ہے رجنیش کا کوئی پیروکار اصرار کرے کہ نہیں گرو رجنیش منفرد تھا۔ وہ ایک ہی تھا۔ چلیں اسے ایک موقع دے دیتے ہیں اور دوسری صفت کی طرف بڑھتے ہیں۔ دوسری صفت بے نیاز ہونا ہے، اللہ صمد ہے، اسے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔لیکن ہر کسی کو اس کی ضرورت ہے۔

رجنیش کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ وہ دمے کا مریض تھا۔ اسے ذیابیطس بھی تھی۔ وہ اپنی بیماری تک دور نہ کرسکتا تھا۔ وہ آپ کی اور میری بیماری کیا دور کرے گا؟ جب وہ امریکہ گیا تو امریکی حکومت نے اسے گرفتار کرلیا تھا۔ ذرا اندازہ کیجیے' خدا قید میں ہے۔' کیا خدا کو قید کیا جاسکتا ہے؟ وہ جو خود کو آزاد نہیں کرواسکا، آپ کو اور مجھے کیا آزاد کروائے گا۔ ہمارے مسائل اور پریشانیاں کیا دور کرے گا؟

گرو رجنیش نے یہ بیان بھی دیا تھا کہ مجھے زہر دیا گیا ہے۔تصور کیجیے! کیا خدا کو زہر دیا جاسکتا ہے؟

جب وہ یونان میں تھا تو یونان کے لاٹ پادری صاحب نے بیان دیا کہ اگر اس شخص کو یونان سے نہ نکالا گیا تو اس کے اور اس کے پیروکاروں کے مکانات تباہ کردیے جائیں گے۔ اور یونانی حکومت کو اسے جلاوطن کرنا پڑا۔ کیا یہ بے نیازی ہوتی ہے؟ کیا اسے صمدیت کہتے ہیں؟

تیسری صفت یہ ہے کہ خدا نہ کسی سے پیدا ہوا ہے اور نہ اس سے کوئی پیدا ہوا ہے۔ یعنی نہ وہ ماں باپ رکھتا ہے اور نہ اولاد۔ مجھے یہ تو علم نہیں کہ گرو رجنیش کے کتنے بچے تھے لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس کی ماں بھی تھی اور باپ بھی۔ وہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جبل پور میں پیدا ہوا اور ۱۹ ر جنوری ۱۹۹۰ء کو مرگیا۔ لیکن جب آپ پونہ میں اس کے مرکز میں جائیں تو وہاں تحریر ہے:

بھگوان رجنیش

"جو نہ کبھی پیدا ہوا، نہ کبھی مرا، اس نے ۱۱ ر دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹ ر جنوری

۱۹۹۰ء تک اس دنیا کا دورہ کیا۔"

لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ دنیا کے اکیس ممالک میں اسے ویزا دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔ وہ ان اکیس ممالک میں جانا چاہتا تھا لیکن نہیں جا سکا۔ اندازہ کیجیے خدا خود دنیا کے دورے پر آیا ہوا ہے اور اپنی دنیا کے اکیس ممالک میں جانا چاہتا ہے لیکن نہیں جا سکتا، کیا یہی خدا کا وہ تصور ہے جس پر آپ یقین رکھتے ہیں؟

اور اب آخری شرط کہ خدا کا ہم سر یعنی اس جیسا اور کوئی نہیں ہے۔ اس کی مثال نہیں دی جا سکتی، اس کا کسی سے تقابل نہیں کیا جا سکتا، اگر آپ خدا کا تصور کرنے میں کامیاب ہو جائیں، اس کی تصویر بنانے میں کامیاب ہو جائیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ خدا نہیں ہے۔ خدا کی تجسیم ممکن نہیں ہے۔

جبکہ گرو رجنیش کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ گرو رجنیش کے لمبے بال تھے، ایک لمبی لہراتی ہوئی داڑھی تھی، جس کا رنگ سفید تھا، اس نے ایک چوغہ سا پہنا ہوا ہوتا تھا۔ یعنی آپ بڑی آسانی سے اس کا تصور کر سکتے ہیں اور وہ جو تصور میں آ جائے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

خدا کا کسی سے تقابل بھی ممکن نہیں ہے۔ فرض کیجیے کوئی شخص بطورِ مثال کہتا ہے کہ خدا آرنلڈ شوارزینیگر سے ہزاروں گنا طاقت ور ہے۔ آرنلڈ مسٹر یونیورس، طاقتور ترین انسان تھا۔ اسی طرح دارا سنگھ ایک طاقت ور پہلوان تھا۔ لیکن جس وقت آپ تقابل کریں گے، جس وقت آپ کہیں گے کہ خدا آرنلڈ شوارزینیگر سے، دارا سنگھ سے، یا کنگ کانگ سے ہزاروں گنا طاقت ور ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ آپ کا تصورِ خدا ہی غلط ہے۔ خواہ آپ یہی کہہ رہے ہوں کہ خدا کسی سے ایک کروڑ گنا طاقتور ہے لیکن بہرحال آپ تقابل تو کر رہے ہوں گے اور خدا کی صفت یہ ہے کہ اس کا تقابل نہیں ہو سکتا۔

﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ ﴾

"اور کوئی اس کا ہم سر نہیں۔"

لہٰذا اب یہ بات میں اپنے معزز، دانش مند، سامعین پر چھوڑتا ہوں کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ ان کے ذہن میں خدا کا کیا تصور ہے؟ اور کیا ان کا تصور ان شرائط پر پورا اترتا ہے؟ کیا ان کے اس تصور میں یہ چاروں خصوصیات پائی جاتی ہیں جو قرآن بیان کر رہا ہے، اگر آپ کا جواب ہاں میں ہے تو ہم مسلمانوں کو آپ کے تصورِ خدا پر کوئی اعتراض نہیں اور ہم اسے اللہ تعالیٰ تسلیم کرتے ہیں، بصورتِ دیگر فیصلہ آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لیکن یہ دلائل سننے کے بعد بھی بالعموم ایک دہریہ آپ کی بات قبول نہیں کرے گا۔ وہ کہے گا کہ میں ان دلائل کو نہیں مانتا۔ میں ایک ہی چیز کو حتمی مانتا ہوں اور وہ ہے سائنس۔

اتنا تو میں بھی مانتا ہوں کہ آج کا دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ لہٰذا آیئے ہم سائنسی علوم کی روشنی میں قرآن کا جائزہ لیتے ہیں۔ دہریے یہی کہتے ہیں کہ ہم صرف اسی دعوے کو درست مانتے ہیں جو سائنس کی روشنی میں درست ثابت ہو۔ بصورتِ دیگر ہم خدا کو نہیں مانتے۔

میں ان تمام تعلیم یافتہ حضرات سے ایک سوال کرنا چاہوں گا جو خدا پر یقین نہیں رکھتے لیکن سائنس پر پورا ایمان رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے سامنے ایک مشین آئے جس کے بارے میں آپ نے نہ کچھ سنا ہو، نہ پڑھا ہو، نہ ہی اسے کبھی دیکھا ہو تو آپ کے خیال میں وہ پہلا شخص کون ہوگا جو آپ کو اس مشین کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کر سکے۔ یہ مشین ایک دہریے کے سامنے ہے جو صرف سائنس پر یقین رکھتا ہے تو اس کے خیال میں کون ہوگا جو اس مشین کے نظامِ عمل کے بارے میں علم رکھتا ہو؟

میں نے یہ سوال سینکڑوں دہریے لوگوں سے، مذہب کے منکر لوگوں سے کیا ہے، تھوڑے سے غور و فکر کے بعد ان کا جواب عموماً یہی ہوتا ہے:

''شاید اس مشین کا بنانے والا ہی یہ معلومات دے سکتا ہے۔''

کچھ کہتے ہیں موجد، کچھ خالق کا لفظ استعمال کریں گے، کچھ تیار کنندہ کا۔ سینکڑوں لوگوں سے سوال کرنے کے بعد بھی مجھے ملتے جلتے جواب ہی ملے ہیں۔ بہرحال جواب کچھ

بھی ہو میں تسلیم کر لیتا ہوں۔ دوسرا شخص کون ہوگا؟ یہ وہ شخص بھی ہوسکتا ہے جسے خالق نے بتایا ہو اور کوئی ایسا شخص بھی ہوتا ہے جو اپنی تحقیق سے درست نتائج تک پہنچ گیا ہو لیکن پہلا بہرصورت وہی ہوگا جو اس مشین کا خالق ہے، موجد ہے، تیار کنندہ ہے، بنانے والا ہے۔

اب میں اس دہریے سے، منکرِ خدا سے، جو صرف سائنس پر یقین رکھتا ہے ایک اور سوال کرتا ہوں کہ بتاؤ یہ کائنات کس طرح وجود میں آئی؟

وہ جواب دیتا ہے کہ دراصل پہلے صرف مادے کا ایک مجموعہ تھا جسے پرائمری نیبولا (Primary Nebula) کہتے ہیں۔ پوری کائنات یہی تھی۔ پھر ایک بہت بڑا دھماکہ (Big Bang) ہوا۔ جس کے نتیجے میں ثانوی تقسیم ہوئی اور کہکشائیں وجود میں آئیں۔ ستارے اور سیارے بنے۔ اور یہ زمین بھی وجود میں آئی جس پر ہم رہ رہے ہیں۔

میں کہتا ہوں یہ جنوں پریوں کی کہانیاں تم نے کہاں سے سنی ہیں؟ وہ کہتا ہے ''نہیں، یہ جنوں پریوں کی کہانیاں نہیں ہیں بلکہ یہ تو سائنسی حقائق ہیں جو کل ہی ہمارے علم میں آئے ہیں۔ سائنس کی دنیا میں ''کل'' سے مراد نصف صدی یا ایک صدی کا عرصہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہ ۱۹۷۳ء کا واقعہ ہے کہ دو سائنسدانوں کو ''عظیم دھماکے کا نظریہ Big Bang Theory دریافت کرنے پر نوبل انعام سے نوازا گیا۔''

میں کہتا ہوں بالکل ٹھیک۔ تمہاری ہر بات سے مجھے اتفاق ہے، لیکن اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ یہ بات قرآن میں آج سے ۱۴۰۰ سال پہلے ہی بیان فرما دی گئی تھی۔ سورۂ انبیاء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ○ ﴾ [الانبیآء: ۳۰]

''یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟

میرا قرآن آج سے چودہ صدیاں پیش تر نازل ہوا تھا۔ اس بات کے کافی ثبوت

موجود ہیں کہ یہ وہی کتاب ہے جو ۱۴۰۰ سال پہلے موجود تھی۔ تو پھر یہ کیوں کر ممکن ہوا کہ اس میں عظیم دھماکے کے نظریے کی طرف اشارہ موجود ہے؟

اس آیت میں انتہائی اختصار کے ساتھ Big Bang Theory موجود ہے۔ تم کہتے ہو یہ نظریہ سو یا پچاس سال پہلے سامنے آیا ہے تو پھر قرآن میں اس کا ذکر کہاں سے آ گیا؟

لا مذہب اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ ''شاید کسی نے اندازہ لگایا ہوگا۔'' میں بحث نہیں کرتا، ان کی بات مان لیتا ہوں اور آگے بڑھتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ زمین جس پر ہم رہ رہے ہیں، اس کی شکل کیسی ہے؟ جواب ملتا ہے کہ پہلے تو لوگ یہی سمجھتے تھے کہ زمین چپٹی ہے اور اسی لیے وہ طویل سفر سے گھبراتے بھی تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ زمین کے کنارے پر پہنچ کر نیچے گر پڑیں۔ لیکن آج ہمارے پاس اس بات کے کافی سائنسی ثبوت موجود ہیں کہ زمین چپٹی نہیں ہے۔ زمین دراصل گول یعنی کرے کی شکل میں ہے۔ میں پوچھتا ہوں یہ بات آپ کو کب معلوم ہوئی؟

جواب ملتا ہے، ماضی قریب میں، سو سال پہلے، دو سو سال پہلے اور اگر جواب دینے والا صاحب علم ہو تو اس کا جواب ہوتا ہے کہ پہلا شخص جس نے یہ بات ثابت کی تھی وہ سر فرانسس ڈریک تھا، جس نے ۱۵۹۷ء میں یہ ثابت کیا کہ زمین کروی ہے۔

میں اسے کہتا ہوں کہ سورۂ لقمان کی اس آیت کا تجزیہ کرے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ ﴾ [لقمان: ۲۹]

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں؟ اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے، سب ایک وقت مقرر تک چلے جا رہے ہیں اور (کیا تم نہیں جانتے کہ) جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

پروتے ہوئے لانے سے مراد ہے ایک سست رو اور بتدریج تبدیلی۔ یعنی رات آہستہ آہستہ، بتدریج دن میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے اور رات دن میں۔ یہ عمل اس طرح ہونا ممکن ہی نہیں اگر زمین چپٹی ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ زمین کی شکل کروی ہو۔ اسی طرح کا ایک پیغام ہمیں قرآنِ مجید کی سورۃ الزمر میں بھی ملتا ہے، جہاں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ○ ﴾ [الزمر: ۵]

''اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے۔ وہی دن پر رات اور رات پر دن کو **لپیٹتا** ہے۔ اسی نے سورج اور چاند کو اس طرح مسخر کر رکھا ہے کہ ہر ایک، ایک وقت مقرر تک چلے جا رہا ہے۔ جان رکھو! وہ زبردست ہے اور درگزر کرنے والا ہے۔''

دن کو رات پر لپیٹنے اور رات کو دن پر لپیٹنے کا یہ عمل بھی صرف اسی صورت میں ممکن ہے اگر زمین گول یعنی کرہ نما ہو۔ زمین کے چپٹے ہونے کی صورت میں یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ آپ مجھے بتاتے ہیں کہ یہ بات ۱۵۹۷ء میں سامنے آئی تھی تو پھر قرآنِ عظیم میں یہ بات ایک ہزار چار سو سال پہلے کس طرح موجود تھی؟

ہوسکتا ہے وہ کہیں کہ یہ بھی اتفاق تھا، محض ایک اتفاق، ایک اندازہ جو درست ثابت ہوا۔ میں یہاں بھی بحث نہیں کرتا اور آگے بڑھتا ہوں۔

میرا اگلا سوال یہ ہوگا کہ چاند سے جو روشنی ہم تک پہنچتی ہے یہ کس چیز کی روشنی ہوتی ہے؟ وہ مجھے بتائے گا کہ پہلے ہم یہی سمجھتے تھے کہ یہ چاند کی اپنی روشنی ہوتی ہے۔ لیکن آج جب کہ سائنس ترقی کر چکی ہے، آج ہم جانتے ہیں کہ دراصل یہ سورج کی روشنی ہوتی ہے جو چاند سے منعکس ہوکر زمین تک آتی ہے۔ چاند خود سے روشن نہیں ہے۔

اس کے بعد میں اس سے ایک اور سوال کروں گا۔ اور وہ یہ کہ قرآنِ مجید کی سورۂ

فرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ تَبَارَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَجَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا وَقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝ ﴾ [الفرقان: ٦١]

”بڑا متبرک ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور ایک قمرِ منیر روشن کیا۔“

عربی میں چاند کے لیے لفظ ”قمر“ استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کی روشنی کے لیے لفظ ”منیرا“ استعمال ہوا ہے۔ جس سے مراد منعکس یا منعطف روشنی ہوتی ہے ”نور“ کا لفظ ایسی ہی روشنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

تم کہتے ہو کہ یہ حقیقت تم نے آج دریافت کی ہے، تو پھر بتاؤ، قرآن میں یہ بات ۱۴۰۰ سال پہلے کس طرح موجود تھی؟ وہ فوری جواب نہیں دے سکے گا، اسے کچھ دیر سوچنا پڑے گا اور شاید بالآخر اس کا جواب یہی ہوگا کہ غالباً یہ بھی محض اتفاق ہے، اندازہ ہے یا ”تکا لگ گیا ہے۔“

میں اس سے پھر بھی بحث نہیں کروں گا۔ گفتگو آگے چلانے کے لیے میں بحث سے گریز کروں گا۔ میں کہوں گا کہ اگر تمھارا جواب یہی ہے تو میں تم سے بحث نہیں کرتا۔ اور بات آگے بڑھاتا ہوں۔

میں اسے کہتا ہوں کہ میں نے ۱۹۸۲ء میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس وقت ہمیں بتایا گیا تھا کہ سورج ساکن ہے یعنی اپنے مرکز کے گرد تو مسلسل حرکت کر رہا ہے، گھوم رہا ہے، لیکن اپنے مقام کے لحاظ سے ساکن ہے۔ ہوسکتا ہے وہ پوچھے کہ کیا قرآن بھی یہی کہتا ہے؟ میرا جواب ہوگا کہ نہیں۔ یہ بات تو ہمیں سکول میں بتائی گئی تھی، میں اس سے پوچھوں گا کہ کیا واقعی اسی طرح ہے؟

وہ کہے گا کہ نہیں۔ آج سائنس ترقی کر چکی ہے۔ اب ہمیں پتہ چلا ہے کہ سورج اپنے مرکز کے گرد گھومنے کے علاوہ مداری حرکت بھی کر رہا ہے۔ سورج کی مرکز کے گرد حرکت کا

آپ مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں، اگر آپ کے پاس ضروری آلات موجود ہوں۔ سورج کی سطح پر سیاہ دھبے موجود ہیں اور ان دھبوں کی حرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج اپنے مرکز کے گرد ایک چکر تقریباً پچیس دن میں پورا کر لیتا ہے۔ لیکن اس حرکت کے علاوہ سورج ایک مدار میں بھی حرکت کر رہا ہے۔

کیا قرآن کہتا ہے کہ سورج ساکن ہے؟ ہوسکتا ہے وہ دہریہ جس سے میں گفتگو کر رہا ہوں اس موقع پر ہنسنے لگے۔

لیکن پھر میں بتاتا ہوں کہ نہیں۔ قرآن میں فرمایا گیا:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ ﴾ [الانبیآء: ۳۳]

”اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔“

قرآن بتا رہا ہے کہ سب ایک فلک میں، ایک مدار میں حرکت کر رہے ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ اگر یہ بات جدید سائنس نے حال ہی میں دریافت کی ہے تو پھر قرآن میں یہ بات چودہ سو سال پہلے ہی کس طرح بیان کر دی گئی تھی؟

وہ تھوڑی دیر تک خاموش ہی رہتا ہے اور کچھ دیر کے بعد کہتا ہے کہ عرب علم فلکیات کے ماہر تھے۔ لہٰذا ہوسکتا ہے عربوں میں سے کسی نے یہ بات تمہارے پیغمبر ﷺ سے کی ہو اور انھوں نے اسے اپنی کتاب میں درج کر دیا ہو!

میں مانتا ہوں، تسلیم کرتا ہوں کہ عرب علم فلکیات میں انتہائی ترقی یافتہ تھے لیکن ساتھ ہی میں اسے یاد دلاتا ہوں کہ وہ تاریخ کو گڈمڈ کر رہا ہے۔ کیوں کہ عربوں کا فلکیات میں ترقی کرنا بہت بعد کی بات ہے اور قرآن اس سے صدیوں پہلے نازل ہو چکا تھا۔ بلکہ دراصل عربوں کے فلکیات میں ترقی کرنے کا سبب ہی قرآن تھا۔ علم فلکیات عربوں سے قرآن میں نہیں آیا، قرآن سے عربوں نے سیکھا تھا۔ قرآن بہت سے سائنسی حقایق کا ذکر کرتا ہے۔

جغرافیے کے حوالے سے اور پھر ''آبی چکر'' (Water Cycle) کے حوالے سے دیکھیے تو قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ﴾ [الزمر: ۲۱]

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو سوتوں اور چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین کے اندر جاری کیا، پھر اس پانی کے ذریعہ سے وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی قسمیں مختلف ہیں۔''

قرآن آبی چکر کا ذکر متعدد آیات میں کرتا ہے اور پوری تفصیل کے ساتھ کرتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ پانی سمندروں کی سطح سے بخارات بن کر اٹھتا ہے۔ بادلوں میں تبدیل ہوتا ہے۔ بادل بالآخر کثیف ہو جاتے ہیں، ان میں بجلیاں چمکتی ہیں اور ان سے بارش ہوتی ہے۔ اس مظہر کا ذکر قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں آیا ہے۔

سورۂ مومنون میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ۱۸]

''اور آسمان سے ہم نے ٹھیک حساب کے مطابق ایک خاص مقدار میں پانی اُتارا اور اس کو زمین میں ٹھہرا دیا، ہم اسے جس طرح چاہیں غائب کر سکتے ہیں۔''

سورۂ روم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴾ [الروم: ۴۸]

''اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو آسمان میں پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انھیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے،

پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے برساتا ہے تو وہ یکا یک خوش و خرم ہو جاتے ہیں۔''

سورۂ نور میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ﴾ [النور: ٤٣]

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ بادل کو آہستہ آہستہ چلاتا ہے۔ پھر اس کے ٹکڑوں کو باہم جوڑتا ہے، پھر اسے سمیٹ کر ایک کثیف ابر بنا دیتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ اس کے خول میں سے بارش کے قطرے ٹپکتے چلے آتے ہیں۔''

سورۂ روم میں فرمایا گیا:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ [الروم: ٢٤]

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ تمھیں بجلی کی چمک دکھاتا ہے، خوف کے ساتھ بھی اور طمع کے ساتھ بھی۔ اور آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں، ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

یعنی قرآن متعدد مقامات پر آبی چکر کی تفصیلات بیان کرتا ہے۔ جب کہ یہ آبی چکر (Water Cycle) ایک سائنسدان نے جس کا نام Bernard Palacy تھا، ۱۵۸۰ء میں بیان کیا تھا۔ جو آبی چکر سائنس ۱۵۸۰ء میں دریافت کر رہی ہے وہ قرآن میں اس سے ہزار سال پہلے ہی موجود تھا؟ کیسے؟

اب ہم ''ارضیات'' کی جانب آتے ہیں۔ علم ارضیات میں ایک تصور بیان کیا جاتا

ہے جسے Folding کہتے ہیں۔جس زمین پر ہم رہتے ہیں اس کی بیرونی پرت یا سطح خاصی باریک ہے۔اس سطح میں بل پڑنے کے سبب پہاڑی سلسلے وجود میں آتے ہیں جو سطح زمین کو استحکام فراہم کرتے ہیں۔اب میں اس دہریے کو بتاتا ہوں کہ قرآنِ مجید کی سورۂ نبا میں بتایا گیا ہے:

﴿ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ○ وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا ○ ﴾ [النباء: ٦۔٧]

''کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے زمین کو فرش بنایا اور پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا۔''

قرآن کہتا ہے کہ پہاڑوں کو میخیں بنایا گیا ہے۔''اوتاد'' عربی میں اس میخ کو کہا جاتا ہے جو خیمہ کھڑا کرنے کے لیے گاڑی جاتی ہے۔اور جدید سائنس بھی پہاڑوں کا اسی طرح کا کردار بیان کرتی ہے۔

یعنی پہاڑوں کی مثال خیموں کی میخوں کی سی ہے۔قرآن مزید کہتا ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ○ ﴾ [الانبیآء: ٣١]

''اور ہم نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ انھیں لے کر ڈھلک نہ جائے، اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں۔''

گویا قرآن یہ کہتا ہے کہ زمین میں پہاڑ اس لیے بنائے گئے ہیں تاکہ زمین ڈھلکنے سے محفوظ رہے۔

مزید برآں میرے پوچھنے پر وہ دہریہ کہے گا کہ اس کے علم میں ہے کہ سمندر میں میٹھا اور کھارا پانی بعض جگہوں پر الگ الگ رہتے ہیں۔ان کے درمیان ایک روک موجود ہوتی ہے۔ایک آڑ موجود ہوتی ہے جو دونوں طرح کے پانی کو ملنے نہیں دیتی اور الگ الگ رکھتی ہے۔مَیں اُسے سورۂ فرقان کی یہ آیت سناتا ہوں:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ

وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ○ ﴾ [الفرقان : ۵۳]

''اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔ ایک لذیذ وشیریں، دوسرا تلخ وشور۔ اور دونوں کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ ایک رکاوٹ ہے جو انھیں گڈ مڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔''

اسی طرح کی بات سورۂ رحمان میں بھی کی گئی ہے:

﴿ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ○ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ○ ﴾

[الرحمٰن : ۲۰۔۱۹]

''دو سمندروں کو اس نے چھوڑ دیا کہ باہم مل جائیں، پھر بھی ان کے درمیان ایک پردہ حائل ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے۔''

آج جدید سائنس بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ بعض مقامات پر سمندر میں میٹھا اور کھاری پانی ایک دوسرے میں حل نہیں ہوتے، ان کے درمیان ایک روک موجود رہتی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ دہریہ جس سے میں گفتگو کر رہا ہوں وہ اس موقع پر کہے کہ ''شاید کسی عرب نے سمندر میں غوطہ لگا کر اس روک کو دیکھ لیا ہوگا اور رسول اللہ ﷺ کو بتادیا ہوگا، یوں یہ بات قرآن میں آگئی ہوگی۔''

لیکن بات یہ ہے کہ جس روک یا آڑ کا یہاں ذکر یہاں ہو رہا ہے، وہ نظر تو آتی ہی نہیں۔ یہ تو ایک نادیدہ رکاوٹ ہے۔ اسی لیے قرآن اس کے لیے ''برزخ'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

یہ مظہر انتہائی واضح طور پر ''کیپ ٹاؤن'' کے قریب دیکھا جاسکتا ہے۔ یعنی افریقہ کے انتہائی جنوب میں۔ مصر میں بھی جہاں دریائے نیل سمندر سے ملتا ہے، یہی صورتِ حال ہوتی ہے۔ اسی طرح خلیج عرب میں جہاں ہزاروں کلومیٹر تک دونوں طرح کا پانی موجود ہے، لیکن الگ الگ رہتا ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ انبیاء میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ○ ﴾ [الانبیآء: ۳۰]

''کیا وہ لوگ جنھوں نے (نبی ﷺ کی بات ماننے سے) انکار کردیا ہے، غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان و زمین باہم ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے انھیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی؟ کیا وہ (ہماری اس خلاقی کو) نہیں مانتے؟''

آپ ذرا تصور کیجیے کہ عرب کے صحراؤں میں جہاں پانی کی شدید قلت ہوتی ہے، وہاں یہ بات کہی جارہی ہے۔ وہاں کس کو یہ خیال آسکتا تھا کہ ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے۔ اگر انھیں اندازہ لگانا ہی ہوتا تو وہ ہر چیز کا اندازہ لگاسکتے تھے، انھیں کسی بھی چیز کا خیال آسکتا تھا، سوائے پانی کے۔ آج جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ ہر زندہ چیز خلیوں سے بنی ہے۔ ان خلیات کا بنیادی جزو سائٹو پلازم Cytoplasm ہوتا ہے جو کہ اسی فی صد پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر زندہ چیز پچاس سے نوے فی صد پانی پر مشتمل ہوتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آج سے چودہ صدیاں پیش تر، یہ بات قرآنِ حکیم میں کیوں کر بیان کردی گئی تھی؟ اب وہ دہریہ بھی چپ ہوچکا ہوگا۔ وہ کوئی جواب دینے کے قابل نہیں ہوگا۔

شماریات کا ایک نظریہ ہے جسے Theory of Probability کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کے دو ممکنہ جوابات ہوسکتے ہیں۔ ایک صحیح اور ایک غلط۔ اگر آپ محض اندازے سے جواب دیں تو پچاس فی صد امکان ہے کہ آپ کا جواب درست ہوگا۔ مثال کے طور پر جب آپ ٹاس کرتے ہیں تو دونوں طرف پچاس پچاس فی صد امکان ہوتا ہے۔ لیکن اگر آپ دو دفعہ ٹاس کریں تو اس بات کا کتنا امکان ہے کہ دونوں مرتبہ ہی آپ کا جواب درست ہوگا۔ پہلی مرتبہ پچاس فی صد یعنی دو میں سے ایک اور دوسری مرتبہ پچاس فی صد کا پچاس فی صد یعنی چار میں سے ایک امکان یا

یوں کہیے کہ پچیس فی صد امکان ہے کہ آپ دونوں مرتبہ درست جواب دیں گے۔

فرض کیجیے میں ایک پانسہ (Dice) پھینکتا ہوں جس کے چھ رخ ہے۔ ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، اور ۶۔ اب اگر میں اندازہ لگاؤں تو اس اندازے کے درست ہونے کا امکان چھ میں سے ایک ہوگا۔ اب اگر میں دو دفعہ ٹاس کروں اور ایک دفعہ پانسہ پھینکوں تو یہ امکان کتنا ہے کہ ہر دفعہ میں جواب درست ہوگا؟

یہ امکان ہوگا، ۲/۱ ضرب ۲/۱ ضرب ۶/۱ یعنی ۲۴/۱ یا دوسرے لفظوں میں چوبیس میں ایک امکان یہ ہے کہ میرا جواب ہر بار درست ہوگا۔

آیئے یہ نظریہ (Theory of Probability) قرآن پر لاگو کرکے دیکھتے ہیں۔ محض گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھانے کے لیے ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ قرآن میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ محض اندازے ہیں جو درست ثابت ہوئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان اندازوں کے درست ہونے کا امکان کتنا تھا؟

قرآن کہتا ہے کہ زمین گول یعنی کرہ نما ہے۔ اب آپ دیکھیے کہ زمین کی شکل کے بارے میں کیا اندازے لگائے جاسکتے ہیں؟ کسی شخص کے ذہن میں زمین کی کون سی ممکنہ شکلیں آسکتی ہیں؟

کہا جاسکتا ہے کہ زمین چپٹی ہے یا تکون ہے یا چوکور ہے یا شش پہلو ہے یا ہشت پہلو ہے، اسی طرح بہت سی ممکنہ شکلیں سوچی جاسکتی ہیں، ذہن میں آسکتی ہیں۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ صرف تیس ممکنہ شکلیں ہوسکتی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص محض اندازہ لگاتا ہے تو اس اندازے کے درست ثابت ہونے کا امکان ۳۰ میں سے ایک ہوگا۔

چاند کی روشنی یا تو اس کی اپنی ہوگی یا منعکس ہوگی لہٰذا دو ہی صورتیں ہیں اور یہاں اندازہ درست ثابت ہونے کا امکان دو میں سے ایک ہے۔ لیکن یہ امکان کہ ایک شخص کے دونوں اندازے درست ثابت ہوں گے، ساٹھ میں ایک ہے۔

اچھا، اب یہ بتایئے کہ صحرائے عرب میں رہنے والا شخص کیا اندازہ لگائے گا کہ انسان

بلکہ تمام جاندار کس شے سے بنے ہوئے ہیں؟ اور اندازہ بھی صحرا کے رہنے والے شخص نے ہی لگانا ہے تو اس کا جواب کیا ہوسکتا ہے؟ ہوسکتا ہے اس کا جواب ریت ہو، یا لکڑی یا لوہا یا کوئی اور دھات یا کوئی گیس یا تیل۔ وہ شخص دس ہزار اندازے لگا سکتا ہے اور اس کا آخری اندازہ پانی ہوگا۔

قرآن کہتا ہے کہ ہر زندہ مخلوق پانی سے بنائی گئی ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط﴾ [الانبیآء: ۳۰]

''اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔''

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا گیا:

﴿ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ج﴾ [النور: ٤٥]

''اور اللہ نے ہر جاندار ایک طرح کے پانی سے پیدا کیا۔''

یہ بات اگر محض اندازے سے کی جائے تو اندازہ درست ہونے کا امکان دس ہزار میں ایک ہوگا۔ اب یہ امکان کہ ایک شخص مذکورہ بالا تینوں معاملات میں اندازے سے جواب دے اور ہر بار اس کا اندازہ درست ثابت ہو، چھ لاکھ میں سے ایک ہے۔ یعنی ۰٫۰۰۰۱۷ فی صد۔ اب میں یہ آپ حاضرین پر چھوڑتا ہوں کہ اس کے بعد آپ Theory of Probability کا اطلاق قرآن پر کرنا چاہیں گے یا نہیں۔

قرآن ایسے سینکڑوں حقائق کا ذکر کرتا ہے جو اس وقت یعنی نزولِ قرآن کے زمانے میں لوگوں کے علم میں نہیں تھے۔ اگر ان تمام بیانات کو اندازے فرض کیا جائے تو ان اندازوں کے بیک وقت درست ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ اور Probability کے نظریے کی رو سے تو یہ امکان صفر ہی رہ جاتا ہے۔

یہاں کچھ لوگ یہ سوال کرسکتے ہیں کہ'' ذاکر صاحب کیا آپ قرآن کو سائنس کی مدد سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟'' لہٰذا میں یہ یاددہانی ضروری سمجھتا ہوں کہ'' قرآن سائنس کی کتاب نہیں ہے۔ یہ سائنز کی کتاب ہے۔ یعنی؛

Quran is not a book of Science

It is a Book of SIGNS.

یعنی یہ نشانیوں کی، آیات کی کتاب ہے، اس کتاب میں چھ ہزار آیات موجود ہیں۔ جن میں سے ایک ہزار سے زاید آیات ایسی ہیں جن کا تعلق سائنسی علوم سے ہے۔ میں سائنس کو قرآن کے اثبات کے لیے استعمال نہیں کر رہا کیوں کہ کسی چیز کو ثابت کرنے کے لیے آپ کو کسی پیمانے کی، کسی معیار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ہم مسلمانوں کے لیے آخری پیمانہ اور حتمی معیار خود قرآن ہے۔ قرآن ہی ہمارے لیے فرقان یعنی حق و باطل کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ اسی پیمانے پر ہم یعنی مسلمان صحیح اور غلط بیان کا فیصلہ کرتے ہیں۔

لیکن ایک دہریے کے لیے، ایک پڑھے لکھے شخص کے لیے جو خدا پر ایمان ہی نہیں رکھتا، اس کے لیے معیار کیا ہے؟ اس کے لیے تو آخری پیمانہ سائنس ہی ہے۔ لہٰذا میں اپنی بات اس کے سامنے اسی کے پیمانے سے درست ثابت کر رہا ہوں۔ البتہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سائنسی نظریات بسا اوقات تبدیل بھی ہو جایا کرتے ہیں، لہٰذا ہم نے صرف ثابت شدہ سائنسی حقائق ہی کو سامنے رکھا ہے۔ میں نے محض نظریات اور مفروضوں کی بنیاد پر بات نہیں کی۔ یعنی ایسے نظریات کو دلیل نہیں بنایا جن کی بنیاد مفروضوں پر ہے۔ میں نے اس کو یہ بتایا ہے کہ جو چیز تمھارے معیار اور پیمانے نے آج سے سو یا پچاس برس پہلے ثابت کی ہے قرآن اسے چودہ سو سال پہلے ہی بیان کر رہا تھا۔ لہٰذا بالآخر ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن ہی برتر ہے۔ سائنس اور قرآن میں سے برتری قرآن ہی کو حاصل ہے۔ قرآن متعدد سائنسی حقائق ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی ﴾ [طٰہٰ: ۵۳]

”وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کا فرش بنایا اور اس میں تمھارے چلنے کو

راستے بنائے اور اوپر سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے نباتات کے جوڑے نکالے۔''

آپ یہ بات ماضی قریب میں دریافت کر رہے ہیں کہ نباتات میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح سورۂ انعام میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴾

[الانعام : ۳۸]

'' زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو، یہ سب تمھاری ہی طرح کی انواع ہیں، ہم نے ان کی تقدیر کے نوشتے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ پھر یہ سب اپنے رب کی طرف سمیٹے جاتے ہیں۔''

سائنس اس بات کا اثبات کچھ ہی عرصہ قبل کر رہی ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ نحل میں بتایا گیا ہے کہ شہد کی مکھی شہد بنانے کے لیے رس جمع کرتی ہے۔ یہاں اس کے لیے مونث کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی یہ کام نر مکھی نہیں کرتی بلکہ مادہ مکھی کرتی ہے۔ سائنس نے یہ حقیقت بھی حال ہی میں دریافت کی ہے، ورنہ پہلے سائنس دانوں کا خیال تھا کہ یہ کام نر مکھی کرتی ہے۔ یہ مکھیاں صرف نو دریافت شدہ پودوں اور پھولوں کی اطلاع دیگر مکھیوں کو دیتی ہیں۔

سورۂ عنکبوت میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾

[العنکبوت : ۴۱]

''اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر، مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔''

یہاں بات محض مکڑی کے گھر یعنی جالے کی ظاہری کمزوری کے حوالے سے نہیں کی

جا رہی۔ یہ آیت مکڑی کی گھریلو زندگی کی خصوصیت بھی بیان کر رہی ہے کہ تعلقات کے لحاظ سے بھی سب سے کمزور گھر مکڑی کا ہی ہوتا ہے۔ کیوں کہ بسا اوقات مادہ مکڑی اپنے نر کو ہلاک کر دیتی ہے۔

اسی طرح سورۂ نمل کی آیت نمبر ۱۷ اور ۱۸ میں چیونٹیوں کے باتیں کرنے کا ذکر ہے۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ تو جنوں پریوں کی کہانیوں والی بات ہے۔ کیا چیونٹیاں بھی آپس میں بات کر سکتی ہیں؟

لیکن آج سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ حیوانات میں سے چیونٹیوں کا طرزِ زندگی انسانی طرزِ زندگی کے قریب ترین ہے۔ یعنی انسانی طرزِ حیات سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ چیونٹیوں میں مردہ چیونٹیوں کو دفنانے کی عادت بھی موجود ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے درمیان رابطے کا ایک مکمل نظام موجود ہوتا ہے۔ ان کے درمیان پیغامات کی ترسیل کا ایک باقاعدہ نظام پایا جاتا ہے۔

اسی طرح سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ﴾

[النحل: ٦٩]

''اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے، جس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔''

اس آیت قرآنی میں فرمایا گیا کہ شہد میں انسانوں کے لیے شفا رکھی گئی ہے اور آج سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ شہد میں جراثیم کش خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روسی فوجی دورانِ جنگ اپنے زخموں پر شہد لگاتے رہے۔ اور نہ صرف ان کے زخم مندمل ہو جاتے تھے بلکہ زخم کا نشان بھی بہت کم باقی رہتا تھا۔ بعض اقسام کی الرجی کے علاج کے لیے شہد آج بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔

اسی طرح قرآن دورانِ خون اور دودھ کی افزائش کے حوالے سے بھی بات کرتا ہے۔

سورۂ نحل کی آیت نمبر ٦٦ اور سورۂ مومنون کی آیت نمبر ۲۱ میں یہ ذکر موجود ہے اور نزول قرآن کے چھ سو سال بعد ابن نفیس نے دورانِ خون کا عمل دریافت کیا۔ مغربی دنیا کے حوالے سے دیکھا جائے تو نزول قرآن کے ایک ہزار سال بعد Harvey نامی سائنس دان نے یہ نظریہ عام کیا۔

قرآن علم الجنین کے بارے میں بھی بات کرتا ہے۔ قرآنِ مجید کی سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات، سورۂ علق کی درجِ ذیل آیات تھیں۔

﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ o ﴾

[العلق : ۲-۱]

''پڑھو (اے نبی ﷺ!) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔
جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔''

''علقۃ'' کا ترجمہ خون کا لوتھڑا ہی نہیں ہوتا بلکہ اس لفظ کا مطلب ''چپکنے والی چیز'' اور ''جونک نما چیز'' بھی ہوتا ہے۔ یہ آیت اور قرآن میں موجود علم الجنین کے حوالے سے موجود دیگر بیانات پروفیسر کیتھ مور کو دکھائے گئے تھے۔ پروفیسر صاحب کا تعلق ٹورنٹو، کینیڈا سے ہے اور وہ اس شعبے کے اعلیٰ ترین ماہرین میں سے شمار کیے جاتے ہیں۔

کچھ عرب حضرات نے اس قرآنی ہدایت پر عمل کیا کہ ''اگر تم نہیں جانتے تو ان سے پوچھ لو جو جانتے ہیں'' اور وہ پروفیسر کیتھ مور کے پاس چلے گئے۔ یہ سارا لوازمہ ان کے سامنے رکھا اور ان سے پوچھا کہ کیا یہ تمام باتیں ٹھیک ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا کہ قرآنی بیانات میں سے بیش تر تو جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں سو فی صد درست ہیں لیکن بعض بیانات ایسے ہیں، جن کے بارے میں وہ کوئی رائے نہیں دے سکتے کیوں کہ انھیں خود اس بارے میں مکمل علم حاصل نہیں ہے۔

ان آیات میں سے ایک آیت وہ تھی جس میں فرمایا گیا ہے کہ ''ہم نے انسان کو ایک جونک نما شے سے تخلیق کیا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب اپنی تجربہ گاہ میں گئے۔ انھوں نے جونک کی

تصاویر کا تقابل جنین کے بالکل ابتدائی مراحل کے ساتھ کیا۔ طاقتور خوردبین سے تفصیلی جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ بالکل ابتدائی مراحل کے جنین اور جونک میں واقعی مشابہت پائی جاتی ہے۔

لہٰذا انھوں نے یہ بیان دیا کہ جو کچھ قرآن میں فرمایا گیا ہے، وہ صحیح اور درست ہے۔

یہی نہیں، پروفیسر مور نے آیاتِ قرآنی سے اخذ کردہ یہ معلومات اپنی کتاب ''The Developing Human'' کے تیسرے اڈیشن میں شامل کیں۔ اس کتاب کو اس سال کسی ایک مصنف کی لکھی ہوئی بہترین طبی کتاب کا ایوارڈ بھی ملا۔ ڈاکٹر مور نے یہ بھی تسلیم کیا کہ علم الجنین کے حوالے سے قرآن جو معلومات فراہم کرتا ہے، جدید سائنس نے وہ باتیں حال ہی میں دریافت کی ہیں۔ کیوں کہ علم الجنین تو علم طب کی جدید ترین شاخوں میں سے ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ یہ باتیں کسی انسان کے علم میں آج سے چودہ سو برس پہلے موجود ہوں۔ لہٰذا قرآن لازماً ایک الہامی کتاب ہے۔

قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿ فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ○ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ○ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ○ ﴾ [الطارق: ۷۔۵]

''پھر ذرا انسان یہی دیکھ لے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔''

اور آج جدید علم الجنین ہمیں بتاتا ہے کہ ابتدائی مراحل میں جنسی اعضاء یعنی فوطے اور رحم وغیرہ اس مقام سے بنتے ہیں جہاں گردے ہوتے ہیں یعنی ریڑھ کی ہڈی اور گیارھویں بارھویں پسلی کے درمیان۔

سورۂ نجم میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَأَنَّهُ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ ○ مِنْ نُّطْفَةٍ إِذَا تُمْنَىٰ ○ ﴾

[النجم: ۴۶۔۴۵]

”اور یہ کہ اسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا ایک بوند سے، جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔“

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ٥ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ٥ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ٥ ﴾ [القیمۃ: ۳۹۔۳۷]

”کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے، پھر اس سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔“

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کی جنس کا تعین نطفہ کرتا ہے۔ یعنی مرد بچے کی جنس کا ذمہ دار ہوتا۔ جدید سائنس نے یہ حقیقت بھی حال ہی میں دریافت کی ہے۔

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جنین تین اندھیروں یا تین تہوں کے اندر ہوتا ہے۔ اور جدید تحقیقات بھی اس بات کی تائید کرتی ہیں۔

جنین کے ارتقا کے مختلف مراحل کا ذکر بھی قرآن میں بڑی تفصیل کے ساتھ موجود ہے:

﴿ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ٥ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ٥ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ٥ ﴾ [المومنون: ۱۴۔۱۲]

”ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا۔ پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی۔ پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا۔ پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کر دیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاری گروں سے اچھا کاری گر۔“

سورۂ حج میں بھی یہ مراحل بیان فرمائے گئے ہیں:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ﴾ [الحج: ۵]

''لوگو، اگر تمھیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے پھر گوشت کی بوٹی سے، جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی۔ (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔ ہم جس نطفے کو چاہتے ہیں، ایک وقت خاص تک رحموں میں ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر تم کو ایک بچے کی صورت میں نکال لاتے ہیں۔ (پھر تمھیں پرورش کرتے ہیں) تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں سے کوئی پہلے ہی واپس بلا لیا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تاکہ سب کچھ جاننے کے بعد پھر کچھ نہ جانے۔''

سورۂ سجدہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ ﴾ [السجدہ: ۹]

''پھر اس کو نک سک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں۔''

الدھر میں دوبارہ ارشاد ہوا:

﴿ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴾ [الدھر: ۲]

''ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔''

مذکورہ بالا دونوں آیاتِ قرآنی میں سننے کی صلاحیت کا ذکر "دیکھنے کی صلاحیت" یعنی بصارت سے پہلے آیا ہے۔ آج کا جدید علم طب بھی ہمیں یہی بتاتا ہے کہ سماعت کی قوت پہلے آتی ہے اور بصارت کی بعد میں، سماعت کا نظام پانچویں مہینے میں بن چکا ہوتا ہے جبکہ بصارت ساتویں ماہ میں مکمل ہوتی ہے۔

لوگوں نے سوال کیا کہ مرنے کے بعد تو انسان کی ہڈیاں بھی مٹی میں مل کر مٹی ہو چکی ہوں گی تو پھر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن انسان کو دوبارہ کس طرح زندہ کرے گا؟

جواب میں فرمایا گیا:

﴿ اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝ ﴾ [القیمۃ : ٤-٣]

"کیا انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں؟ ہم تو اس کی انگلیوں کی پور پور تک ٹھیک بنا دینے پر قادر ہیں۔"

مندرجہ بالا آیت میں ہڈیوں کے ساتھ انگلیوں کی پوروں کا ذکر کیوں فرمایا گیا ہے؟ قرآن کا بیان ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انگلیوں کی پوریں بھی ٹھیک بنا دینے پر قادر ہے۔ یہ ذکر کیوں کیا جا رہا ہے؟

۱۸۸۰ء میں انگلیوں کے نشانات Finger Prints کی مدد سے لوگوں کی شناخت کا طریقہ دریافت ہوا۔ یہ طریقہ کار آج بھی لوگوں کی شناخت کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ کیوں کہ لاکھوں کروڑوں لوگوں میں کوئی دو انسان بھی ایسے نہیں ہوتے جن کی انگلیوں کے نشانات یکساں ہوں۔

اور قرآن آج سے چودہ سو سال پہلے ہی اس طرف اشارہ دے رہا ہے۔

ایسی بہت سی مثالیں مزید پیش کی جا سکتی ہیں۔ اگر آپ قرآن اور سائنس کے حوالے سے مزید تفصیلات جاننا چاہیں تو میری کتاب "Quran & Modern Science"[1] سے

[1] اس کتاب کا اُردو ترجمہ "قرآن اور سائنس" کے نام سے دارالنوادر کی جانب سے شائع کیا جا چکا ہے۔

رجوع کر سکتے ہیں۔

میں صرف ایک مثال مزید پیش کرنا چاہوں گا۔ تھائی لینڈ سے تعلق رکھنے والے ایک سائنس دان تھے، جن کا نام تھا Prof-Thagada Shaun انھوں نے درد اور درد محسوس کرنے والے اعضا کے حوالے سے کافی تحقیقات کی ہیں۔ قبل ازیں خیال یہی تھا کہ درد محسوس کرنے کا عمل ایک دماغی عمل ہے۔ یعنی دماغ اعصاب کی مدد سے درد محسوس کرتا ہے۔ لیکن حال ہی میں دریافت ہوا ہے کہ درد محسوس کرنے کے عمل میں جلد بھی ذمہ دار ہوتی ہے۔ جلد میں Pain Receptors ہوتے ہیں جن کی مدد سے انسان درد محسوس کرتا ہے۔

قرآنِ مجید کی سورۂ نسا میں فرمایا گیا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ﴾ [النساء: ٥٦]

’’جن لوگوں نے ہماری آیات کو ماننے سے انکار کردیا ہے، انھیں بالیقین ہم آگ میں جھونکیں گے۔ اور جب ان کے بدن کی کھال جل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری کھال پیدا کردیں گے تاکہ وہ خوب عذاب کا مزہ چکھیں۔‘‘

قرآن کی یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ جلد کا درد محسوس کرنے کے عمل سے براہِ راست تعلق ہے۔ یعنی یہاں Pain Receptors کی طرف واضح اشارہ موجود ہے۔

ڈاکٹر تھاگاڈا کو جب اندازہ ہوا کہ یہ کتاب آج سے ۱۴۰۰ سال قبل ہی یہ معلومات فراہم کر رہی تھی تو انھوں نے صرف اس ایک دلیل کی بنیاد پر قاہرہ میں ایک طبی کانفرنس کے دوران اسلام قبول کرنے کا اعلان کردیا۔ اور برسرِعام کہہ دیا:

((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ))

’’اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔‘‘

اب اگر ایک دہریے سے پوچھا جائے کہ یہ تمام معلومات قرآن میں کہاں سے آ گئی ہیں تو اس کا جواب کیا ہونا چاہیے؟ اس کے پاس ایک ہی جواب ہوگا۔ وہی جواب جو

ہمارے پہلے سوال کا تھا۔ پہلا سوال یہ تھا کہ ایک نامعلوم مشین کے بارے میں معلومات کس سے مل سکتی ہیں؟ جواب تھا۔ بنانے والے سے، خالق سے۔

قرآن میں یہ سارے حقائق بیان کرنے والا بھی اس کائنات کا خالق، اس کا بنانے والا اس کا ایجاد کرنے والا ہی ہے۔ جس کے لیے انگریزی میں GOD کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور عربی میں بہتر طور پر اللہ کا لفظ مستعمل ہے۔

Francis Beacon نے بجا طور کہا تھا:

''سائنس کا نامکمل علم آپ کو ملحد بنا دیتا ہے لیکن سائنس کا وسیع اور عمیق مطالعہ آپ کو خدا پر ایمان رکھنے والا بنا دیتا ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ آج کا سائنسدان جھوٹے خداؤں کو تو رد کر چکا ہے یعنی لا الٰہ کے مقام پر تو پہنچ چکا ہے لیکن ''الا اللہ'' کی منزل تک نہیں پہنچ پایا۔

میں اپنی گفتگو کا اختتام قرآنِ مجید کی اس آیت پر کرنا چاہوں گا:

﴿ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ ﴾ [حٰمٓ السجدہ: ۵۳]

''عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی۔ یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے۔ کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ تیرا رب ہر چیز کا شاہد ہے۔''

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ط

☆......☆......☆

حصہ دوم

سوال:...... مسلمان، خدا کو اللہ کہہ کر کیوں پکارتے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... میری بہن نے سوال پوچھا ہے کہ مسلمان خدا کے لیے لفظ ''اللہ'' کیوں استعمال کرتے ہیں؟ اپنی گفتگو کے دوران میں نے قرآنِ مجید کی سورۂ اخلاص سے اللہ کی تعریف آپ کے سامنے پیش کی تھی۔ ان آیات میں فرمایا گیا ہے:

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ ﴾ [الاخلاص: ٤-١]

''کہو وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے۔ اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہم سر نہیں ہے۔''

لیکن قرآنِ مجید میں یہ بھی فرما دیا گیا ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ ﴾ [بنی اسرائیل: ١١٠]

''اے نبیؐ! ان سے کہو'' اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں۔''

یعنی ہر اچھا نام اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ یہ بات قرآنِ مجید میں دیگر متعدد مقامات پر بھی فرمائی گئی ہے۔ سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۚ ﴾ [الاعراف: ١٨٠]

''اللہ اچھے ناموں کا مستحق ہے، اسے اچھے ناموں ہی سے پکارو۔''

﴿ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ ﴾

[الحشر: ٢٤]

''وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں۔''

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝ ﴾ [طٰه: ٨]

''وہ اللہ ہے۔اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔اس کے لیے بہترین نام ہیں۔''

گویا تمام بہترین نام اللہ ہی کے لیے ہیں لیکن ایک تو یہ نام خوبصورت ہونے چاہئیں اور دوسرے ان ناموں کو سن کر آپ کے ذہن میں کوئی تصویر نہیں بنی چاہیے۔یعنی ان ناموں میں تجسیم کا کوئی پہلو نہیں ہونا چاہیے۔

رہی یہ بات کہ مسلمان لفظ اللہ کو انگریزی لفظ GOD کے مقابلے میں ترجیح کیوں دیتے ہیں تو اس کا سبب یہ ہے عربی لفظ'' اللہ'' ایک خالص اور منفرد لفظ ہے۔ جب کہ انگریزی لفظ'' گاڈ'' کی یہ صورت نہیں۔اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ممکن ہے۔اگر آپ اس لفظ کے آخر میں حرف''S'' لگادیں تو یہ GODS بن جاتا ہے یعنی جمع کا صیغہ لیکن عربی لفظ''اللہ'' کی کوئی جمع نہیں ہے۔لہٰذا بہت سے خداؤں کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔اللہ ایک ہی ہے۔

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ ﴾ [الاخلاص : ۱]

''کہو وہ اللہ ہے، یکتا۔''

اسی طرح اگر آپ انگریزی لفظ GOD کے آخر میں''ESS'' کا اضافہ کردیں تو یہ ایک اور لفظ GODESS بن جائے گا۔یعنی'' مونث خدا''۔ جب کہ عربی لفظ اللہ کے ساتھ تذکیر و تانیث کا کوئی تصور وابستہ نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ جنس کے تصور سے پاک ہے۔ انگریزی لفظ کے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر آپ اسے بڑے''G'' سے لکھیں گے تو اس کا مطلب خدا ہوگا لیکن اگر آپ اسے چھوٹے''g'' سے لکھیں گے تو پھر اس کا مطلب ''دیوتا'' یا''جھوٹے خدا'' ہوگا۔

اسلام میں صرف ایک ہی معبودِ حقیقی یعنی اللہ کا تصور موجود ہے۔ہم کسی دیوتا وغیرہ پر یقین نہیں رکھتے۔

اگر آپ لفظ God کے بعد Father کا اضافہ کردیں تو یہ Godfather بن جاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ'' فلاں میرا گاڈ فادر ہے'' یعنی فلاں میرا سرپرست ہے۔لیکن لفظ اللہ

کے ساتھ اس نوع کا کوئی اضافہ ممکن نہیں۔ ''اللہ ابا'' یا ''اللہ باپ'' جیسا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اسی طرح اگر آپ God کے بعد Mother کا اضافہ کریں تو لفظ Godmother بن جائے گا۔ اس قسم کا کوئی لفظ بھی اسلام میں نہیں پایا جاتا۔

لفظ God سے قبل Tin لگا دیا جائے تو یہ Tingod بن جاتا ہے جس کے معنی ہیں جھوٹے خدا یا جعلی خدا۔ لیکن لفظ اللہ کے ساتھ اس قسم کا کوئی سابقہ یا لاحقہ لگانا ممکن ہی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ پاک ہے۔ واحد و یکتا ہے۔ آپ اسے کسی بھی نام سے پکار سکتے ہیں لیکن یہ نام خوبصورت ہونا چاہیے۔

میں اُمید رکھتا ہوں کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال:...... اَرون شوری نے لکھا ہے کہ قرآنِ مجید کی چوتھی سورۃ کی گیارھویں بارھویں آیت میں ورثا کے حصے بیان کرتے ہوئے جو تفصیل بیان کی گئی ہے، اگر آپ ان تمام حصوں کو جمع کریں تو حاصل جمع ایک سے زیادہ آتا ہے۔ بقول ارون شوری اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے مصنف کو ریاضی نہیں آتی تھی۔ آپ سے گزارش ہے کہ وضاحت فرمائیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... میرے بھائی نے سوال یہ پوچھا ہے کہ ارون شوری کا دعویٰ ہے کہ ''قرآنِ پاک کی سورۂ نسا کی آیت گیارہ اور بارہ میں بیان کردہ ورثا کے حصوں کو اگر جمع کیا جائے تو جواب ایک سے زیادہ آتا ہے'' اور یہ کہ ''اس طرح پتہ چلتا ہے کہ قرآن کے مصنف کو ریاضی نہیں آتی تھی۔'' (نعوذ باللہ)

جیسا کہ میں نے پہلے بھی اپنی گفتگو کے دوران میں واضح کیا تھا، بات یہ ہے کہ یوں تو سینکڑوں لوگ ہیں جو قرآن میں غلطیاں تلاش کرنے کے دعوے کرتے ہیں لیکن اگر آپ تجزیہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ تمام دعوے غلط اور جھوٹے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک دعویٰ بھی ایسا نہیں جسے ثابت کیا جا سکے۔

جہاں تک وراثت کا تعلق ہے، قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اس حوالے سے بات کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل آیات میں وراثت کا بیان موجود ہے۔

سورۂ بقرہ...... آیت ۱۸۰

سورۂ بقرہ...... آیت ۲۴۰

سورۂ نسا...... آیت ۱۹

لیکن جہاں تک ان حصوں کی پوری تفصیل کا تعلق ہے تو یہ سورۂ نساء کی آیات ۱۱، ۱۲ اور پھر ۱۷۶ میں بیان کی گئی ہے۔ ارون شوری نے جس بیان کا ذکر کیا ہے وہ سورۂ نساء کی گیارھویں اور بارھویں آیت میں موجود ہے، جہاں فرمایا گیا ہے:

﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِن كَانَ لَهُ وَلَدٌ فَإِن لَّمْ يَكُن لَّهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِن كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّكُمْ وَلَدٌ فَإِن كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم مِّن بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ وَإِن كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ۝ ﴾ [النساء: ۱۱-۱۲]

"تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ: مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اگر (میت کی وارث) دو سے زاید لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے۔ اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔ اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے۔ اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصے کی حق دار ہوگی۔ (یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے) جب کہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کردی جائے قرض جو اس پر ہو ادا کردیا جائے۔ اور تم نہیں جانتے کہ تمھارے ماں باپ اور تمھاری اولاد میں سے کون بلحاظِ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کردیے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔

اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو، اس کا آدھا حصہ تمھیں ملے گا، اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمھارا ہے۔ جب کہ وصیت جو انھوں نے کی ہو پوری کردی جائے اور قرض جو انھوں نے چھوڑا ہو ادا کردیا جائے اور وہ تمھارے ترکے میں سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی، اگر تم بے اولاد ہو، ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا۔ بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو وہ پوری کردی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کردیا جائے۔

اور اگر وہ مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکے کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے جب کہ وصیت

جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا بینا اور نرم خو ہے۔''

گویا مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان آیات میں پہلے اولاد پھر والدین اور پھر دیگر حصے دار بیان کر دیے گئے ہیں۔ اسلام وراثت کے بارے میں بڑی تفصیلی اور مکمل رہنمائی دیتا ہے۔ ان آیات میں بنیادی اصول بیان کر دیے گئے ہیں۔ مکمل تفاصیل کے لیے ہمیں حدیث کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے کہ جس کی تحقیق میں پوری زندگی صرف کی جا سکتی ہے۔ جب کہ ارون شوری صرف دو آیات پڑھ کر خود کو قانونِ وراثت پر رائے دینے کا اہل سمجھتا ہے۔

اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ریاضی کی ایک پیچیدہ مساوات حل کرنا چاہتا ہے لیکن علم ریاضی کے بنیادی اصول بھی نہیں جانتا۔ مثال کے طور پر وہ اصول جسے BODMAS کہا جاتا ہے، یعنی:

BO: Brackets off

D: Division

M: Multiplication

A: Addition

S: Subtraction

یہ ترتیب BODMAS کا اصول کہلاتی ہے۔ اگر اس ترتیب کو نظر انداز کر دیا جائے، آپ پہلے تفریق کریں پھر ضرب دیں پھر جمع کر دیں تو یقیناً آپ کا جواب غلط ہوگا، اسی طرح کا معاملہ ارون شوری کا ہے۔

ایک سیدھا سا اصول ہے کہ آپ والدین اور میاں یا بیوی کا حصہ ادا کرنے کے بعد اولاد میں ترکہ تقسیم کریں گے۔ اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس طرح حصوں کا کل میزان ایک

سے زیادہ آ جائے۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال :...... میں ایک نومسلم ہوں۔ میں نے ۱۹۸۰ء میں عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کیا، میں اپنے والدین کو یہ یقین کس طرح دلا سکتی ہوں کہ قرآن، انجیل کی نقل نہیں ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... میری بہن نے ایک سوال پیش کیا ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ پہلے مسیحی تھیں اور پھر انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ میں انھیں مبارک باد دینا چاہوں گا اور ایک بار نہیں بلکہ تین بار مبارک باد دینا چاہوں گا۔ میں نے پہلے کہا تھا کہ میں دہریے کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اس نے ''لا الہ'' تو کہہ دیا ہے۔ بہن کو میں تین دفعہ مبارک باد اس لیے دے رہا ہوں کہ اس نے ''لا الہ'' کہنے کے بعد ''الا اللہ'' بھی کہہ دیا ہے اور ''محمد رسول اللہ'' بھی کہہ دیا ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ ط

''کوئی معبود نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کے اور محمدؐ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ پیغمبر ہیں۔''

لہٰذا میں اپنی بہن کو مبارک باد دیتا ہوں اور اب آتا ہوں ان کے سوال کی جانب۔

سوال یہ ہے کہ وہ اپنے والدین کے سامنے یہ بات کس طرح ثابت کریں گی کہ قرآن بائبل کی نقل نہیں ہے۔ یا بائبل سے استفادہ نہیں کرتا۔

جیسا کہ میں نے پہلے آپ کو بتایا کہ ایک تاریخی حقیقت ہی ایسی ہے جو اس قسم کی کسی بات کا امکان ہی ختم کر دیتی ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی ﷺ اُمّی تھے۔ یعنی پڑھے لکھے نہیں تھے۔

قرآن کہتا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ط ﴾ [الاعراف : ۱۵۷]

''(پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر نبی اُمیؐ کی پیروی

اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔"

اور بائبل میں کہا گیا ہے:

"اور پھر وہ کتاب کسی ناخواندہ کو دیں اور کہیں اس کو پڑھ اور وہ کہے میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔" [یسعیاہ۔ باب ۲۹۔۱۲]

قرآن نے کہا کہ اس بات کا ذکر انجیل میں موجود ہے اور اگر آپ انجیل کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ واقعی موجود ہے۔ وہ مستشرقین جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے انجیل سے استفادہ کیا تھا (نعوذ باللہ)، وہ یہ بات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اس وقت تک انجیل کا عربی زبان میں کوئی ترجمہ ہوا ہی نہیں تھا۔

عہد نامہ عتیق کا قدیم ترین عربی ترجمہ بھی پیغمبر اسلامؐ کے دو سو سال بعد کا ہے جب کہ عہد نامہ جدید کا عربی ترجمہ تو کہیں ۱۶۱۶ء میں جا کر ہوا تھا۔ یعنی ایک ہزار سال بعد۔ یہ بات میں تسلیم کرتا ہوں کہ دونوں کتابوں میں کہیں کہیں جزوی مماثلتیں موجود ہیں لیکن اس کا سبب استفادہ نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ دراصل ایک تیسرا ذریعہ ہے جو دونوں کتابوں کی اصل ہے۔

تمام الہامی کتابوں کا بنیادی پیغام یعنی توحید تو ایک ہی ہے۔ گویا تمام الہامی کتابوں کا پیغام مشترک ہے۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ سابقہ کتب سماویہ ایک خاص عرصے کے لیے تھیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا کہ وحی کی سابقہ صورتیں کسی خاص مدت یا خاص قوم کے لیے تھیں۔ لہٰذا وہ اپنی اصل صورت میں باقی نہ رہ سکیں اور ان میں تحریف راہ پاگئی۔ اب ان کتب میں بہت سی انسانی تحریفات موجود ہیں۔ لیکن ان تحریفات کے باوجود چوں کہ ان کی اصل ایک ہی تھی، لہٰذا مشترک نکات کا پایا جانا عین قرینِ قیاس ہے۔

محض ان مشابہتوں کی بنا پر یہ دعویٰ کر دینا بالکل غلط ہوگا کہ قرآنِ مجید میں انجیل یا دیگر صحائف سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یا یہ کہ حضرتِ محمد مصطفیٰ ﷺ نے بائبل سے نقل کر کے قرآن تحریر کر دیا تھا۔ (نعوذ باللہ من ذالک)

اور اس طرح تو یہ کہنا بھی لازم آتا ہے کہ عہد نامہ جدید میں عہد نامہ عتیق کی نقل کی گئی ہے کیوں کہ ان دونوں میں بھی بہت سی باتیں مشترک ہیں، لہٰذا حضرتِ عیسیٰ نے بھی پرانے عہد نامے سے استفادہ کیا ہوگا۔ (نعوذ باللہ) لیکن بات یہی ہے کہ ان دونوں صحائف کا بھی اصل ماخذ ایک ہی ہے۔

فرض کیجیے کوئی شخص نقل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی امتحان کے دوران میں کوئی شخص کسی سے نقل کرتا ہے، کیا وہ اپنے جواب میں کبھی اس شخص کا ذکر کرے گا جس سے نقل کی جارہی ہے۔ لیکن قرآنِ مجید میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے واضح طور پر حضرتِ موسیٰ اور حضرتِ عیسیٰ علیہما السلام کا ذکر فرمایا ہے۔ قرآن ان انبیا کا ذکر مکمل عزت و احترام کے ساتھ کرتا ہے اور تسلیم کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ اگر قرآن نعوذ باللہ ان کی نقل ہوتی تو کبھی ان کا ذکر نہ کیا جاتا۔ لہٰذا اس سے بھی ثابت ہوجاتا ہے کہ قرآن انجیل کی نقل نہیں ہے۔

محض تاریخی حقائق سے ہوسکتا ہے کہ کسی شخص کے لیے یہ فیصلہ کرنا کچھ مشکل ہو کہ قرآن اور انجیل میں سے کون سی کتاب درست ہے۔ لہٰذا ہم اپنے سائنسی علم سے مدد لیتے ہیں۔

سرسری جائزہ لینے پر قرآن اور بائبل کی بہت سی باتیں، قصص اور نکات یکساں معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر آپ تجزیہ کریں تو فرق آپ کے سامنے آجائے گا۔ مثال کے طور پر انجیل کی کتاب پیدائش میں کہا گیا ہے کہ دنیا چھ دن میں تخلیق کی گئی تھی، لیکن یہاں ''دن'' سے مراد ''۲۴ گھنٹے والا دن'' ہے۔ دوسری طرف قرآن میں بھی فرمایا گیا ہے کہ کائنات چھ ایام میں تخلیق کی گئی تھی۔

﴿ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ط ﴾

[الاعراف: ٥٤]

''درحقیقت تمھارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں

پیدا کیا۔''

یہی بات سورۂ یونس کی تیسری آیت میں اور بعض دیگر مقامات پر بھی کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو چھ ''ایام'' میں پیدا فرمایا۔ عربی لفظ ایام اصل میں ''یوم'' کی جمع ہے۔ یوم سے مراد ''دن'' بھی ہوتا ہے اور ایک طویل زمانہ بھی۔ لہٰذا جب ''چھ ایام'' سے مراد چھ طویل ادوار یا زمانے لیے جائیں تو جدید سائنس بھی اس بیان کو تسلیم کرتی ہے، لیکن جب بائبل یہ دعویٰ کرتی ہے کہ کائنات ۲۴ گھنٹے والے چھ دنوں میں بنی تھی تو کوئی بھی سائنسدان اس بیان کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔

اسی طرح بائبل کہتی ہے کہ دن اور رات پہلے دن بنا دیے گئے تھے جب کہ سورج کی تخلیق چوتھے دن ہوئی تھی۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ نتیجہ پہلے برآمد ہو اور سبب بعد میں تخلیق کیا جائے۔ روشنی کا ذریعہ ہی سورج ہے۔ بغیر سورج کے دن اور رات کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن بائبل کتاب پیدائش کی ابتدائی آیات میں یہی بتاتی ہے کہ روشنی، سورج کی تخلیق سے ۳ دن پہلے ہی تخلیق ہوگئی تھی۔ اور یہ قطعی غیر منطقی بات ہے۔

یہ بھی ایک غیر سائنسی اور غیر منطقی بیان ہے کہ دن اور رات تو پہلے تخلیق ہو جائیں اور زمین بعد میں وجود میں آئے۔ حالانکہ دن اور رات تو دراصل زمین ہی کی حرکت کا نتیجہ ہیں۔ لیکن بائبل یہی کہتی ہے۔

دوسری طرف قرآن بھی روشنی اور سورج کی تخلیق کا ذکر کرتا ہے لیکن قرآن یہ غیر سائنسی بلکہ غیر ممکن ترتیب پیش نہیں کرتا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا آپ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بائبل سے یہ باتیں لیں لیکن ان کی اصلاح کر دی؟ ایسا نہیں ہو سکتا کیوں کہ آج سے چودہ سو سال پہلے یہ باتیں کسی کے علم میں ہی نہیں تھیں۔

بائبل میں بتایا گیا ہے:

''خدا نے کہا کہ آسمان کے نیچے کا پانی ایک جگہ جمع ہو کر خشکی نظر آئے اور ایسا ہی ہوا۔ اور خدا نے خشکی کو زمین کہا اور جو پانی جمع ہو گیا تھا اس کو سمندر اور خدا

نے دیکھا کہ اچھا ہے۔..........سو تیسرا دن ہوا۔

......سو خدا نے دو بڑے نیر بنائے اور ایک نیر اکبر کہ دن پر حکم کرے اور ایک نیر اصغر کہ رات پر حکم کرے اور اس نے ستاروں کو بھی بنایا......سو چوتھا دن ہوا۔'' [پیدائش ۱: ۲۰۔۹]

لیکن آج جدید سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ چاند اور زمین دراصل ایک ہی بڑے ستارے کے حصے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ زمین سورج سے پہلے وجود میں آ جائے۔ لیکن مندرجہ بالا اقتباسات میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ بائبل یہی بتا رہی ہے کہ زمین تیسرے دن تخلیق ہوئی جب کہ سورج چوتھے دن وجود میں آیا۔

بائبل یہ بھی کہتی ہے کہ تمام نباتات تیسرے دن وجود میں آئیں:

''اور خدا نے کہا کہ زمین گھاس اور بیج دار بوٹیوں کو اور پھل دار درختوں کو جو اپنی اپنی جنس کے موافق پھلیں اور جو زمین پر اپنے آپ ہی بیج رکھیں اُگائے اور ایسا ہی ہوا۔'' [پیدائش ۱: ۱۲۔۱۱]

جب سورج چوتھے دن وجود میں آیا۔ سورج کی روشنی کے بغیر نباتات کی افزائش ممکن ہی نہیں ہے۔ اسی طرح سورج اور چاند کے بارے میں بتایا گیا کہ ایک نیر اصغر ہے اور ایک نیر اکبر۔ ایک بڑی روشنی ہے ایک چھوٹی روشنی۔ یعنی بائبل چاند کو بھی ایک از خود روشن جسم قرار دیتی ہے۔

جب کہ قرآن کا بیان میں نے پہلے آپ کے سامنے پیش کیا۔ سورۂ فرقان کی آیت کے پیش نظر پتہ چلتا ہے کہ چاند کی روشنی مستعار ہے۔

تو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہمارے پیغمبرؐ نے بائبل سے یہ باتیں نقل کیں (نعوذ باللہ) لیکن بائبل کی تمام سائنسی غلطیاں درست کر دیں۔ یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے۔

اگر آپ اُن قصص اور واقعات کا جائزہ لیں جو بائبل اور قرآن میں مشترک ہیں تو ان کے درمیان بھی آپ کو فرق نظر آ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بائبل ہمیں حضرت آدم علیہ السلام

کے بارے میں بتاتی ہے کہ زمین پر پہلے انسان حضرتِ آدم علیہ السلام تھے۔ لیکن بائبل ان کی زمین پر آمد کا وقت بھی معین کر دیتی ہے جو کہ تقریباً ۵۸۰۰ سال قبل بنتا ہے۔ جب کہ آج سائنس آثارِ قدیمہ کی مدد سے یہ ثابت کر چکی ہے کہ زمین پر انسان اس سے ہزار ہا سال پہلے بھی موجود تھا۔

اسی طرح بائبل حضرتِ نوح علیہ السلام کے بارے میں بھی تفصیل سے بتاتی ہے۔ اور طوفان نوح علیہ السلام کا بھی ذکر کرتی ہے۔ بائبل کا کہنا ہے کہ یہ طوفان عالم گیر تھا، یعنی پوری زمین پر آیا تھا۔ اور روئے زمین پر موجود تمام حیات اس طوفان کے نتیجے میں فنا ہوگئی تھی۔ سوائے ان کے جو حضرتِ نوح علیہ السلام کی کشتی میں موجود تھے۔ بائبل اس طوفان کا وقت اندازاً اکیسویں یا بائیسویں صدی قبل مسیح کا بتاتی ہے۔ آج ماہرین آثارِ قدیمہ ہمیں بتاتے ہیں کہ مصر کا گیارھواں حکمران خاندان اور بابل میں تیسرا حکمران خاندان اس وقت حکومت کر رہے تھے۔ لیکن ان علاقوں میں اس طوفان کے کسی قسم کے اثرات کا سراغ نہیں ملتا۔

قرآن بھی طوفانِ نوحؑ کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن ایک تو قرآن اس طوفان کا وقت معین نہیں کرتا اور دوسرے قرآنی بیان کے مطابق یہ ایک مقامی طوفان تھا۔ قرآن اس طوفان کے عالم گیر ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔ قرآن کے مطابق یہ سیلاب صرف قومِ نوحؑ کے لیے آیا تھا۔ اور یہ ایک ایسا بیان ہے جس پر آج کے سائنسدان بھی کوئی اعتراض نہیں کر سکتے۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں آپ خود یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں بائبل سے استفادہ موجود ہے یا نہیں؟

سوال:...... پہلی بات تو میں یہ کرنا چاہوں گا کہ تمام ہندو گرو رجنیش کو بھگوان نہیں سمجھتے۔ دوسرے میں ڈاکٹر صاحب سے پوچھنا چاہوں گا کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ہر قوم کی طرف ہدایت بھیجی گئی تھی۔ تو کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وید مقدس بھی الہامی کتابیں ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... بھائی نے سوال پوچھنے سے پہلے ایک بات یہ کی کہ تمام ہندو گرو ر جنیش کو بھگوان نہیں سمجھتے۔ میں نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ تمام ہندو گرو ر جنیش کو بھگوان مانتے ہیں، میری تمام گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے۔ آپ اسی گفتگو کی ویڈیو ریکارڈنگ دیکھ سکتے ہیں لہٰذا یہاں تو یقیناً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ ''بعض ہندو گرو ر جنیش کو بھگوان سمجھتے ہیں۔ میں نے تمام ہندوؤں کے بارے میں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا تھا۔ میں ہندومت کے بارے میں، ہندوؤں کے عقائد کے بارے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں ان متون کا مطالعہ بھی کر چکا ہوں۔

جہاں تک بھائی کے اس سوال کا تعلق ہے کہ چوں کہ قرآن یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے متعدد انبیاء بھیجے ہیں اور متعدد صحائف نازل فرمائے ہیں تو کیا میں وید، شاستروں اور دیگر متون پر بھی یقین رکھتا ہوں؟ دیگر پیغمبروں پر بھی یقین رکھتا ہوں؟ ان کا بنیادی سوال یہی ہے۔ میں ان کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ قرآن ہمیں واقعی یہی بتاتا ہے۔

﴿ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ٥ ﴾ [فاطر: ٢٤]

''ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر۔ اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں ڈرانے والا نہ بھیجا گیا ہو۔''

﴿ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ٥ ﴾ [الرعد: ٧]

''اور ہر قوم کے لیے ایک رہنما ہے۔''

آپ کا سوال یہ ہے کہ کیا ان آیات کی روشنی میں، میں ویدوں پر یا ویدوں کے الہامی ہونے پر یقین رکھتا ہوں؟ کیا میں دیگر پیغمبروں پر یقین رکھتا ہوں؟ بات یہ ہے کہ قرآن ۲۵ انبیائے کرام کا ذکر نام لے کر کرتا ہے۔ حضرتِ آدم، حضرتِ ابراہیم، حضرتِ اسماعیل، حضرتِ موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد ﷺ سمیت ۲۵ انبیائے کرام کے اسمائے گرامی قرآن میں موجود ہیں لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے

کرام کی کل تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار سے زیادہ تھی۔ ان میں سے ۲۵ کے نام ہمیں معلوم ہیں۔ دیگر کے بارے میں امکان ہی ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ یعنی کسی شخص کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ شاید وہ نبی تھے، شاید نہیں تھے۔ ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے۔

تو کیا میں ویدوں کے الہامی ہونے پر یقین رکھتا ہوں؟ پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا ویدوں کی تعلیمات اور قرآنی تعلیمات میں کوئی مطابقت پائی جاتی ہے؟ جی ہاں! ایسی مطابقت موجود ہے۔

مثال کے طور پر ویدوں میں خدا کا ذکر موجود ہے۔ یجر وید کے تیسرے باب کی آیت نمبر ۳۲ میں کہا گیا ہے:

"تم خدا کا کوئی تصور قائم نہیں کر سکتے۔"

یجر وید، باب ۳۳، آیت ۳ میں تحریر ہے:

"خدا جسم اور شکل سے پاک ہے۔"

یجر وید کے باب نمبر ۴۰، آیت نمبر ۸ میں بھی یہی کہا گیا ہے:

"خدا نہ جسم رکھتا ہے اور نہ صورت۔"

آگے چل کر یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

"خدا ایک ہی ہے، دوسرا کوئی خدا نہیں ہے، ہرگز نہیں۔"

اسی طرح رگ وید، جلد ۸، باب ۱، آیت ۱ میں کہا گیا:

"تمام تعریفیں صرف اسی کے لیے ہیں۔"

رگ وید، جلد ۶، باب ۴۵، آیت ۱۶ میں کہا گیا:

"صرف ایک ہی خدا ہے، اسی کی عبادت کرو۔"

ہمیں ویدوں کے اس طرح کے بیانات قبول کرنے میں ہرگز تامل نہیں ہوگا۔ یہ بیانات الہامی بھی ہوسکتے ہیں۔ ہمارے لیے صحیح اور غلط معلوم کرنے کا ایک ہی معیار ہے اور وہ معیار قرآنِ مجید ہے۔ کیوں کہ قرآن ہی اللہ تعالیٰ کی جانب سے آخری اور حتمی ہدایت کا

ذریعہ ہے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں کو مذکورہ بالا بیانات کو تسلیم کرنے یعنی منجانب اللہ تسلیم کرنے پر کوئی اعتراض نہ ہوگا لیکن کچھ دوسری باتیں بھی ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، ان کتابوں میں تحریف و تدلیس ہوتی رہی ہے۔ لہٰذا ان کتابوں کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو کہ انسانی ہے، جو تحریف کے نتیجہ میں ان کا حصہ بنا ہے۔ اور اس حصے کو منزل من اللہ تسلیم کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ غیر سائنسی اور غیر منطقی بیانات جس طرح بائبل میں موجود ہیں اسی طرح ویدوں میں بھی موجود ہیں۔ اس وقت میں ان کے حوالے سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔

سو بات یہ ہے کہ ہمیں یہ امکان تسلیم کرنے پر تو کوئی اعتراض نہیں کہ اپنی اصل صورت میں یہ کتابیں الہامی ہوسکتی ہیں۔ انجیل کے بارے میں ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اپنی اصل صورت میں یہ وحی خداوندی تھی۔ کیوں کہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہ وہ وحی ہے جو حضرتِ عیسیٰ مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔

اسی طرح پیغمبروں کا معاملہ ہے۔ یقیناً بہت سے پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں۔ اور جہاں تک رام اور کرشن وغیرہ جیسی شخصیات کے بارے میں پوچھا جاتا ہے کہ کیا وہ بھی نبی تھے؟ تو ہمارا جواب ہوگا کہ ''وہ نبی ہو بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی'' یعنی ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مجھے ان لوگوں سے بالکل اتفاق نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ رام علیہ السلام یا کرشن علیہ السلام۔ یہ غلط ہے۔

میں یہی کہتا ہوں کہ ان کا نبی ہونا ممکن ضرور ہے لیکن فرض کیجیے کہ رام واقعی اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبر تھے۔ اور فرض کیجیے کہ وید واقعی الہامی کتابیں تھیں۔ پھر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ ظاہر ہے کہ یہ ایک خاص زمانے کے لیے تھے۔ اور اسی زمانے تک محدود تھے۔ ان کا پیغام صرف ایک خاص زمانے کے لوگوں کے لیے ہی تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں تھا۔ قرآن ہی اللہ تعالیٰ کا آخری اور حتمی پیغام ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے، ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے ہے۔

انجیل اور وید وغیرہ کا معاملہ یہ ہے کہ اگر اپنی اصل صورت میں یہ منزل من اللہ تھے تو اپنے زمانے ہی کے لیے تھے۔ آج کے لیے نہیں۔ قرآن آخری وحی ہے اور حضرتِ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر ہیں۔ لہٰذا آج ہمیں ہدایت کے لیے قرآن اور صاحب قرآن ؐ ہی کی پیروی کرنا پڑے گی۔

سوال :...... میرا سوال یہ ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... میری بہن نے سوال پوچھا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو بالعموم ملاحدہ کی جانب سے پوچھا جاتا ہے۔ دہریے اور عقل پسند عموماً یہ سوال پوچھا کرتے ہیں۔ اس سے مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک دفعہ میرے ایک قریبی دوست کا بمبئی کے ایک عقلیت پرست گروپ کے ساتھ مباحثہ ہوگیا۔ اس نے انھیں وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں قائل کرنے کے لیے ان سے سوالات کرنا شروع کیے۔ اس نے ان سے پوچھا کہ کپڑا کہاں سے آیا ہے؟ کتاب کہاں سے آئی ہے؟ قلم کہاں سے آیا ہے؟ ہر چیز کے بارے میں یہ ثابت کرنے کے بعد کہ اس کا کوئی نہ کوئی خالق موجود ہے، اس نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ سورج کہاں سے آیا ہے؟ چاند کو کس نے بنایا ہے؟ اس نے ان سے کہا کہ آپ یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ ہر چیز کا کوئی خالق موجود ہے۔ یہ کوئی ایک شخص بھی ہوسکتا ہے اور ایک کارخانہ بھی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا اب میرے ان سوالوں کا جواب دو کہ سورج اور چاند کا خالق کون ہے؟

ان عقلیت پسندوں نے کچھ توقف کے بعد کہا کہ ہم یہ مان لیتے ہیں کہ ہر چیز کا کوئی خالق موجود ہے، لیکن ہماری شرط یہ ہے کہ آپ اپنا بیان تبدیل نہیں کریں گے یعنی اس بیان پر قائم رہیں گے کہ ہر چیز کا کوئی خالق بھی ہوتا ہے۔ آپ اس بیان سے پھریں گے نہیں۔

میرا وہ دوست بہت خوش ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کامیاب ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنا سوالات کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ سورج کو کس نے بنایا ہے؟ چاند کو کس نے بنایا ہے؟ مجھے میری ماں نے جنم دیا، انھیں اُن کی والدہ نے جنم دیا لیکن سوال یہ ہے کہ پہلا

خالق کون تھا؟

پہلا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس نے ہر چیز کو تخلیق کیا ہے۔ میرے دوست کا خیال تھا کہ وہ اس مباحثے میں غالب آ چکا ہے۔

لیکن پھر دہریے نے ایک سوال کیا۔ اس نے کہا کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آتے ہیں لیکن شرط وہی ہے کہ آپ اپنی دلیل سے پھریں گے نہیں۔ اپنا بیان تبدیل نہیں کریں گے اور سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے؟

میرے دوست کو شدید ذہنی دھچکا پہنچا۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ساری رات سو نہیں سکا۔ اگلے دن وہ میرے پاس آیا اور اس نے یہ پورا واقعہ مجھے سنایا۔ اس کی بات سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ وجود باری تعالیٰ کے اثبات کے لیے وہی دلائل استعمال کر رہا تھا جو پہلے بھی بعض فلاسفہ استعمال کر چکے ہیں۔ اور یہ فلاسفہ منطق کا ایک اہم اصول نظر انداز کر دیتے ہیں اور اپنی بات کا خود تجزیہ نہیں کرتے۔

اگر آپ میری گفتگو کا تجزیہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ میں نے کہیں بھی یہ دلیل استعمال نہیں کی کہ ہر چیز کا کوئی خالق ضرور ہوتا ہے۔ کیوں کہ اگر میں ایسا کہتا تو میں خود ہی پھنس جاتا۔ اسی لیے میں نے یہ دلیل پیش نہیں کی۔

میں نے تو خود دہریے سے یہ سوال کیا تھا کہ کسی بھی چیز کے بارے میں معلومات کس کے پاس ہوں گی؟ اور اس کا جواب تھا کہ اس شے کے خالق کے پاس، موجد کے پاس، یہ جواب میں نے نہیں بلکہ ایک دہریے نے دیا تھا۔

فرض کیجیے یہ سوال مجھ سے کیا جاتا کہ:

''ذاکر بھائی، وہ پہلا شخص کون ہوگا جو کسی بھی نامعلوم مشین کے بارے میں ہمیں مکمل معلومات فراہم کر سکے؟''

میرا جواب یہ ہوگا کہ کوئی بھی شے جو بنائی گئی ہے، جو ایک ابتدا رکھتی ہے اس کے بارے میں، اس کے افعال کے بارے میں معلومات فراہم کرنے والا پہلا شخص اس کا موجد

یا خالق ہی ہوگا۔ میں یہاں اپنی منطق استعمال کر رہا ہوں کیوں کہ میں پھنسنا نہیں چاہتا۔

چناں چہ جب میں یہ جواب دیتا ہوں کہ ہر اس چیز کے بارے میں، جو ایک ابتدا رکھتی ہے، جو کسی وقت تخلیق ہوتی ہے، اس کے بارے میں علم رکھنے والی پہلی شخصیت اس کے خالق کی ہوگی تو اس دلیل کو استعمال کرتے ہوئے یہ بھی ثابت کیا جاسکتا ہے کہ قرآن منزل من اللہ ہے۔

سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ اس کائنات کی ایک ابتدا ہے۔ یہ کسی وقت عدم سے وجود میں آئی تھی۔ اسی طرح سورج کا بھی ایک آغاز ہے۔ چاند کا بھی ایک آغاز ہے۔ لہٰذا یہاں بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی نوعیت وافعال کے بارے میں ہمیں علم کون فراہم کرسکتا ہے اور جواب ہوگا ''کائنات کا خالق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ۔''

آپ نے سوال پوچھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا؟ یہ ایسا ہی سوال ہے جیسے کوئی آپ سے یہ سوال کرے:

''میرے بھائی ٹام نے ایک بچے کو جنم دیا ہے، بتائیں یہ لڑکا ہے یا لڑکی؟

میں ایک ڈاکٹر ہوں اور جانتا ہوں کہ ایک مرد بچے کو جنم نہیں دے سکتا لہٰذا بچے کی جنس کے بارے میں سوال لایعنی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ سوال پوچھنا ہی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کس نے بنایا ہے۔ یہ سوال ہی لایعنی ہے۔ خدا ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اسے کسی نے پیدا نہیں کیا۔ وہ ہمیشہ سے ہے۔

امید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل چکا ہوگا۔

سوال :...... بعض مستشرقین یہ دعویٰ کرتے ہیں بلکہ یہ الزام لگاتے ہیں کہ دراصل نبی کریم ﷺ نے عربوں کی معاشرتی اصلاح کے لیے قرآن تحریر کیا تھا اور اسے الہامی اس لیے قرار دیا تا کہ اس کی قبولیت میں اضافہ ہوسکے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... میرے بھائی نے ایک سوال پیش کیا ہے اور ان کی

اس بات سے میں بھی اتفاق کرتا ہوں کہ بعض مستشرقین واقعی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے محبوب پیغمبر حضرتِ محمد مصطفےٰ ﷺ نے غلط بیانی کی تھی۔ (نعوذ باللہ) اور یہ کہ قرآن کو کلامِ الٰہی قرار دینے سے ان کا مقصد یہ تھا کہ عربوں کی اصلاح کی جاسکے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اور قرآنِ مجید کا مقصد صرف عربوں کی اصلاح نہیں تھا بلکہ پوری انسانیت کی اصلاح تھا۔ ان کا پیغام محض عربوں کے لیے نہیں بلکہ پوری بنی نوع انسان کے لیے تھا۔

لیکن اگر یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے تو اصل سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربوں کی اخلاقی طور پر اصلاح کرنا چاہتے تھے تو وہ اس کے لیے غیر اخلاقی ذرائع کیوں کر استعمال کر سکتے تھے۔ ایک اخلاقی معاشرے کی تشکیل غیر اخلاقی طریقوں سے کس طرح کی جاسکتی ہے۔

آپ خود تصور کیجیے۔ اگر آپ معاشرے کی اخلاقی اصلاح کرنا چاہتے ہوں تو کیا آپ اپنے کام کا آغاز دروغ گوئی سے کریں گے؟

دروغ گوئی اور غلط بیانی سے کام صرف وہی لوگ لیتے ہیں جو درحقیقت اپنا فائدہ چاہتے ہیں۔ جو غلط لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ زبانی طور پر لاکھ کہتے رہیں کہ وہ دنیا کی اصلاح کرنا چاہتے لیکن درحقیقت وہ مال و دولت کی خواہش رکھتے ہیں۔ اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ میں پہلے ہی ثابت کر چکا ہوں کہ انھیں مال و دولت دنیا کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ سو اگر آپ کا مقصد سچائی ہے تو اس مقصد کے حصول کے لیے ذرائع بھی سچائی پر مبنی ہی ہونے چاہئیں۔

﴿ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ﴾ [الانعام: ۹۳]

''اور اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑے، یا کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے درآں حالے کہ اس پر کوئی وحی نازل نہ کی گئی ہو، یا جو اللہ کی

نازل کردہ چیز کے مقابلے میں کہے کہ میں بھی ایسی چیز نازل کر کے دکھادوں گا۔“

اگر نبی کریم ﷺ (نعوذ باللہ) غلط بیانی کر رہے ہوتے تو یقیناً وہ خود اپنی کتاب میں ایسا کرنے والے کو برا بھلا نہ کہتے۔ کوئی بھی ایسا نہ کرے گا کیوں کہ اگر آگے چل کر کوئی جھوٹ سامنے آ جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود کو ہی برا بھلا کہہ رہا تھا۔

اسی طرح آگے چل کر قرآنِ مجید میں پھر ارشاد ہوتا ہے:

﴿ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝ ﴾ [الحاقة: ٤٧-٤٣]

”یہ رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے اور اگر اس (نبیؐ) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے۔ پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا۔“

اگر نبی کریم ﷺ نے کبھی کوئی غلط بیانی کی ہوتی (نعوذ باللہ) تو وہ کبھی یہ باتیں اپنی کتاب میں درج نہ کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے پر یہ غلط بیانی لازماً پکڑی جاتی اور اس وقت ان آیات کا کیا مطلب ہوتا؟

اسی قسم کی بات قرآنِ مجید کی درجِ ذیل آیات میں بھی کی گئی ہے:

﴿ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ ﴾ [الشوریٰ: ٢٤]

”کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ پر جھوٹا بہتان گھڑ لیا ہے؟ اگر اللہ چاہے تو تمھارے دل پر مہر کر دے۔ وہ باطل کو مٹا دیتا ہے اور حق کو اپنے

فرمانوں سے حق کر دکھاتا ہے۔ وہ سینوں میں چھپے ہوئے راز جانتا ہے۔"

﴿ إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝ ﴾ [النحل: ۱۰۵]

"(جھوٹی باتیں نبیؐ نہیں گھڑتا بلکہ) جھوٹ وہ لوگ گھڑ رہے ہیں جو اللہ کی آیات کو نہیں مانتے، وہی حقیقت میں جھوٹے ہیں۔"

اسی طرح قرآنِ مجید میں متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں خود پیغمبر ﷺ کی بات کی اصلاح فرمائی گئی ہے۔ اگر قرآن (نعوذ باللہ) خود رسول اللہ ﷺ کی تصنیف ہوتی جیسا کہ بعض مستشرقین کہتے ہیں تو وہ خود ان باتوں کا ذکر کیوں کرتے؟

اس کی ایک واضح مثال سورۂ عبس میں ملتی ہے:

﴿ عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝ وَهُوَ يَخْشٰى ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝ ﴾ [عبس: ۱۰-۱]

"ترش رو ہوا اور بے رُخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمھیں کیا خبر، شاید وہ سدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو۔ حالاں کہ اگر وہ نہ سدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمھارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے، اس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔"

یہ سورۃ اس وقت نازل ہوئی تھی جب رسول اللہ ﷺ کچھ کفار کے سرداروں سے بات کر رہے تھے اور اس دوران ایک نابینا صحابی جن کا نام عبداللہ ابن مکتوم تھا، وہ اس گفتگو کے دوران الجھن پیدا کر رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ کفار کے سرداروں سے اہم بات چیت فرما رہے تھے۔ نابینا صحابیؓ کو اس دوران میں بات ٹوکنی نہیں چاہیے تھی۔ لہٰذا نبی کریم

نے انھیں سرزنش فرمائی۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا، کیسا ہی شخص ہوتا، یہ بات ایسی نہیں تھی جس پر اعتراض کیا جاسکتا۔ لیکن یہاں معاملہ رسول اللہ ﷺ کا تھا۔ آپ ﷺ کا کردار اس قدر بلند تھا، اس قدر عظیم تھا، آپ ﷺ غریب اور بے سہارا لوگوں کے اس قدر ہمدرد تھے کہ اس بات پر بھی اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ اور آپ ﷺ جب بھی اس صحابیؓ سے ملتے تو اس بات پر ان کا شکریہ ادا کرتے کہ ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اصلاح فرمائی۔

اس قسم کی متعدد مثالیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ تحریم، سورۂ نحل اور سورۂ انفال۔

اگر رسول اللہ ﷺ نے عربوں کی اصلاح کے لیے قرآن خود تحریر کیا ہوتا تو صاف ظاہر ہے کہ یہ مقامات قرآن میں موجود نہ ہوتے۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال :...... آپ نے اپنی گفتگو کے دوران میں ایسے بہت سے سائنسی حقائق کا ذکر کیا جو کہ قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا قرآنِ مجید میں علم ریاضی سے متعلق بھی حقائق موجود ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... بہن نے سوال کیا ہے کہ میں نے ایسے بہت سے سائنسی حقائق کے بارے میں بات کی ہے جن کا ذکر قرآنِ مجید میں موجود ہے۔ تو کیا ایسے ریاضیاتی حقائق بھی ہیں؟ کیا قرآنِ مجید میں ریاضی کے حوالے سے بھی بات کی گئی ہے؟

جی ہاں، قرآن نے ایسی بہت سی باتیں ہمارے سامنے پیش کی ہیں جن کا تعلق ریاضی سے ہے۔ سب سے پہلے تو ہم ارسطو کے پیش کردہ اس اصول کے بارے میں بات کرتے ہیں کہ ہر بیان یا تو درست ہوگا یا غلط۔ یعنی ہر بیان درست بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی۔ صدیاں گزر گئیں اور ہر کوئی اس اصول کو درست تسلیم کرتا رہا۔ سو سال پہلے تک اس اصول کو بالکل درست سمجھا جاتا رہے۔ محض سو سال پہلے ہی ایک شخص نے یہ سوال اٹھایا کہ اگر ہر بیان کے درست یا غلط ہونے کا امکان موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود یہ بیان بھی یا

درست ہوگا یا غلط۔ اگر یہ درست ہے تو ٹھیک، لیکن اگر یہ غلط ہے تو پھر؟ اس صورت میں ریاضی کا پورا نظام ہی منہدم ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد ریاضی دانوں نے ایک نیا موقف اپنایا۔ انھوں نے کہا کہ جب بھی آپ کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے دو ممکنہ معانی ہو سکتے ہیں۔ یعنی ایک تو اصطلاحی معانی اور ایک لغوی معانی۔ بعض اوقات آپ اُس لفظ ہی کے بارے میں بات کر رہے ہوتے ہیں اس کے معانی کے بارے میں نہیں۔ میں آپ کے سامنے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

فرض کیجیے ایک بچہ جس کا نام اکبر ہے۔ میں اس کے بارے میں کہتا ہوں:

''اکبر چھوٹا ہے۔''

اب معانی کے لحاظ سے میں بالکل ٹھیک کر رہا ہوں۔ اکبر ایک چھوٹا لڑکا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اکبر چھوٹا ہے۔ لیکن ایک عربی جاننے والا شخص میری بات پر اعتراض کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اکبر چھوٹا نہیں ہے۔ ''اکبر بڑا ہے۔'' اکبر کا مطلب ہی ''بڑا'' ہوتا ہے۔ اب ہوا یہ ہے کہ میں ایک لفظ کا ذکر کر رہا تھا۔ اس لفظ کو استعمال نہیں کر رہا تھا۔

ایک اور مثال پر غور کیجیے۔ فرض کیجیے میں کہتا ہوں:

''۳ ہمیشہ ۴ سے پہلے آتا ہے۔''

کوئی میری اس بات سے اختلاف نہیں کرے گا۔ ہر کوئی یہی کہے گا کہ میں درست کہہ رہا ہوں۔ واقعی ۳ ہمیشہ ۴ سے پہلے آتا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے ایک متشکک اس بات پر اعتراض کر دے۔ وہ مجھے بتائے گا کہ انگریزی لغت میں Three ہمیشہ Four کے بعد آئے گا۔ کیوں کہ حرف ''T'' ہمیشہ حرف ''F'' کے بعد ہی آتا ہے۔ یہاں معاملہ الٹ ہو گیا۔ میں بات استعمال کے لحاظ سے کر رہا ہوں لیکن وہ متشکک ایک ایسی مثال دے رہا ہے جہاں محض ذکر ہوا ہے۔ استعمال نہیں ہوا۔

یعنی جب آپ ایک لفظ سے کام لیتے ہیں تو اس کی دو ممکنہ صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو

آپ اس لفظ کا ذکر کر رہے ہوں گے اور یا اس لفظ کو استعمال کر رہے ہوں گے۔

اپنی گفتگو کے دوران میں نے سورۂ نساء کی یہ آیت آپ کے سامنے پیش کی تھی:

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴾ [النساء: ۸۲]

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی۔''

اس آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔ اور آج تک کوئی قرآن میں سے اختلاف کی کوئی مثال پیش بھی نہیں کر سکا۔ یعنی قرآن کلام خداوندی ہے۔ لیکن فرض کیجیے یہاں بھی ایک متشکک آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں قرآن میں اختلاف دکھا سکتا ہوں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کہاں؟ وہ کہتا ہے کہ ''سورۂ نسآ، آیت ۸۲ میں ''اختلاف'' کا لفظ اس آیت میں موجود ہے۔ لہٰذا قرآن کا بیان غلط ثابت ہو جاتا ہے۔''

اب اختلاف کا لفظ تو واقعی قرآن میں موجود ہے تو کیا یہ واقعی ایک غلطی ہے؟ (نعوذ باللہ)۔ میں کہتا ہوں ٹھہرو، اس آیت کو غور سے پڑھو۔ یہاں کہا جا رہا ہے کہ ''بہت سے اختلافات ہوتے'' جب کہ تم صرف ایک جگہ اختلاف کا لفظ دکھا رہے ہو۔ یعنی قرآن کا بیان ہی درست ہے۔ کیوں کہ قرآن بہت سے اختلافات کے بارے میں کہہ رہا ہے اور اختلاف کا لفظ قرآن میں ایک ہی بار استعمال ہوا ہے، کثیر تعداد میں استعمال نہیں ہوا۔

لیکن اس طرح میں اس کے سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا۔ کیوں کہ ایک اور متشکک اٹھے گا اور کہے گا کہ دیکھو قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ کسی اور کی جانب سے ہوتا تو تم اس میں ''اختلافاً کثیرا'' پاتے۔ اور آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ''اختلافاً کثیرا'' کے الفاظ اس آیت میں موجود ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ قرآن اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ (نعوذ باللہ)

مجھے اندازہ ہے کہ بات ذرا زیادہ پیچیدہ ہوگئی ہے۔ تفہیم ذرا مشکل ہوگئی ہے لیکن میں ایک آسان مثال بھی پیش کروں گا۔

بہرحال بات مذکورہ آیت کی ہو رہی تھی۔ اس آیت کریمہ میں یہ نہیں کہا گیا کہ:

''اگر قرآن میں کثیر اختلاف ہوں تو یہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے۔''

بلکہ فرمایا جا رہا ہے:

''اگر یہ غیر اللہ کی جانب سے ہوتا تو اس میں کثیر اختلاف ہوتے۔''

اور اسی لیے متشککین کی منطق درست نہیں۔ پہلی صورت میں ان کی منطق درست ہو سکتی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے بات اس انداز میں بیان ہی نہیں فرمائی۔ اور مذکورہ بالا دونوں باتیں الگ ہیں۔ ایک ہی بات نہیں ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے اس مثال پر غور کریں۔

''بمبئی میں رہنے والے تمام لوگ ہندوستانی ہیں۔''

یہ ایک درست بیان ہے۔ لیکن اس بیان سے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے کہ:

''تمام ہندوستانی بمبئی میں رہتے ہیں۔''

تو یہ نتیجہ بالکل غلط ہوگا۔ کسی بیان کی معکوس صورت ہمیشہ درست نہیں ہوتی۔ بعض اوقات یہ صورت بھی درست ہوتی ہے اور بعض اوقات نہیں بھی۔

اب میں ایک سادہ اور آسان سی مثال سے اپنی بات کی وضاحت کرتا ہوں۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ ﴾

[المومنون : ۲۔۱]

''یقیناً فلاح پائی ہے ایمان لانے والوں نے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔''

یہ آیت پڑھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ''ٹھہریں جناب! میں ایک ایسے مسلمان کو جانتا ہوں جو بڑے خشوع و خضوع سے پانچ وقت نماز پڑھتا ہے لیکن وہ دھوکہ باز ہے، لوگوں کو لوٹتا ہے۔ ہر معاشرے میں کالی بھیڑیں ہوتی ہیں لیکن دیکھیں یہاں قرآن کی بات غلط ثابت ہو رہی ہے۔ (نعوذ باللہ) کیوں کہ قرآن کہہ رہا ہے کہ حقیقی مومن اپنی نمازوں میں

خشوع اختیار کرتے ہیں۔‘‘

میں اسے کہوں گا کہ ٹھہرو اور قرآن کے الفاظ غور سے پڑھو۔ قرآن یہ بتارہا ہے کہ حقیقی ایمان والے نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہہ رہا کہ نماز میں خشوع اختیار کرنے والا ہر شخص فلاح یافتہ مومن ہے۔ اگر قرآن نے یہ کہا ہوتا کہ نماز میں خشوع اختیار کرنے والے تمام لوگ فلاح یافتہ مومن ہیں تو یہ بات غلط ثابت ہوسکتی تھی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ریاضی کو سب سے زیادہ جاننے والا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایسے متشککین بھی ہیں جو قرآن میں غلطیاں ہی تلاش کریں گے، لہٰذا وہ منتخب الفاظ استعمال کرتا ہے۔

میں ایک مثال اور پیش کرنا چاہوں گا، قرآنِ مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۚ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ ﴾ [آل عمران: ۵۹]

’’اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہوجا اور وہ ہوگیا۔‘‘

آیت کا مطلب بالکل واضح ہے۔ بتایا جارہا ہے کہ عیسیٰؑ اور آدمؑ دونوں کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا فرمایا، معانی بالکل صاف ہیں لیکن اگر آپ غور کریں تو ایک بات یہ بھی ہے کہ قرآنِ مجید میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ۲۵ مرتبہ آیا ہے اور حضرتِ آدم علیہ السلام کا ذکر بھی ۲۵ بار ہوا ہے، یعنی معانی کے لحاظ سے اگر دونوں یکساں ہیں تو دونوں کا ذکر بھی یکساں تعداد میں ہوا ہے۔

اس قسم کی بہت سی مثالیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں۔ سورۂ اعراف میں فرمایا گیا:

﴿ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ ﴾ [الاعراف: ۱۷۶]

’’اگر ہم چاہتے تو اسے ان آیتوں کے ذریعہ سے بلندی عطا کرتے، مگر وہ تو

زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہش نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا لہٰذا اس کی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی زبان لٹکائے رہے اور اسے چھوڑ دو پھر بھی زبان لٹکائے رہے۔ یہی مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں۔''

''آیات کو جھٹلانے'' کے الفاظ قرآنِ مجید میں پانچ مرتبہ آئے ہیں اور کتے کے لیے عربی لفظ کلب بھی پانچ مرتبہ آیا ہے۔ یعنی مشبہ اور مشبہ بہ معنوی لحاظ سے تو یکساں ہیں ہی، ان کا ذکر بھی یکساں مرتبہ کیا گیا ہے۔

﴿ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴾ [فاطر : ۲۰]

''اور نہ تاریکیاں اور روشنی یکساں ہیں۔''

عربوں میں اندھیرے کے لیے لفظ ''ظلمت'' استعمال ہوتا ہے جب کہ روشنی کے لیے نور کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ظلمت کا لفظ قرآن مجید میں ۲۴ مرتبہ استعمال ہوا ہے جب کہ ''نور'' کا لفظ قرآن میں ۲۳ مرتبہ آیا ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ معنوی لحاظ سے دونوں یکساں نہیں ہیں بلکہ دونوں کا ذکر بھی یکساں تعداد میں نہیں ہوا ہے۔ دونوں برابر نہیں ہیں کیوں کہ ۲۳ اور ۲۴ برابر نہیں ہیں۔

گویا قرآن نے جنھیں یکساں قرار دیا ان کا ذکر بھی یکساں تعداد میں کیا اور جنھیں مختلف قرار دیا ان کا ذکر بھی مختلف ہے۔

اُمید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال :...... میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ لیکن آج ہم سب جانتے ہیں کہ سوچنے کا کام دل نہیں بلکہ دماغ کرتا ہے۔ کیا آپ اس بات کی وضاحت کرسکتے ہیں؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... بہن نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ بہن نے سوال پوچھنے سے پہلے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ نومسلمہ ہیں۔ میں پہلے تو انھیں بھی تین بار مبارک باد

پیش کرتا ہوں۔ انھوں نے پوچھا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید کے بعض مقامات پر فرماتا ہے کہ بعض لوگوں کے ''دلوں پر مہر لگا دی جاتی ہے'' اور یوں ان لوگوں کی اصلاح کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ میں ان کی بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ واقعی قرآنِ مجید میں ایسے ارشادات موجود ہیں۔

ان کا سوال یہ ہے کہ آج سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ سوچنے کا کام دل نہیں بلکہ دماغ کرتا ہے تو پھر قرآن یہاں دل کا ذکر کیوں کر رہا ہے۔ پرانے زمانے میں لوگوں کا یہی خیال تھا کہ سوچنے کا کام دل کرتا ہے۔ تو کیا یہاں (نعوذ باللہ) قرآن کا بیان غلط ہے؟

قرآنِ مجید کی ایک اور آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝ ﴾ [طٰہٰ: ۲۸۔۲۵]

''موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: ''پروردگار، میرا سینہ کھول دے اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے۔ اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔''

یہاں بھی یہی دعا کی جا رہی ہے کہ میرا سینہ یعنی دل کھول دے۔ بات یہ ہے کہ عربی لفظ سے ایک مراد تو سینہ یا دل ہوتا ہے اور دوسرے ''مرکز''۔ لفظ صدر کا ایک مطلب مرکز بھی ہوتا ہے۔ اگر آپ کو کراچی جانے کا اتفاق ہو تو وہاں ایک علاقہ ہے کراچی صدر۔ صدر کراچی سے مراد ہوتی ہے کراچی کا مرکز۔ یعنی لفظ صدر سے مراد مرکز ہے۔ سو قرآن بھی یہاں یہی بتا رہا ہے کہ سوچنے سمجھنے کے مرکز پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ اور اس مرکز سے مراد دماغ بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ میرے فہم و ادراک کے مرکز کو کھول دے۔ (آمین)

اُمید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال:..... ڈاکٹر صاحب کیا یہ تضاد نہیں ہے کہ قرآن بعض مقامات پر بعض کو جن

قرار دیتا ہے اور بعض جگہ فرشتہ؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... بھائی نے سوال پوچھا ہے کہ متعدد مقامات پر ابلیس کو فرشتہ کہا گیا ہے اور پھر ایک مقام پر قرآن اسے جن قرار دیتا ہے تو کیا یہ تضاد نہیں ہے؟
بات یہ ہے کہ قرآن متعدد مقامات پر ابلیس و آدمؑ کا واقعہ بیان کرتا ہے۔ یہ واقعہ قرآنِ مجید میں کئی سورتوں میں موجود ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ، سورۂ اعراف، سورۂ حجر، سورۂ اسراء، سورۂ طٰہٰ، سورۂ صٓ، وغیرہ۔ ان تمام سورتوں میں یہی بات کی گئی ہے کہ جب فرشتوں کو حکم ملا کہ آدمؑ کے سامنے جھک جائیں تو سب سجدے میں جھک گئے سوائے ابلیس کے، جس نے سجدہ کرنے سے انکار کردیا۔ مذکورہ بالا تمام سورتوں میں یہی بات کی گئی ہے لیکن ایک مقام پر ابلیس کو جن قرار دیا گیا ہے۔ جس کے حوالے سے بھائی نے سوال کیا ہے۔ انھوں نے حوالہ نہیں دیا لیکن یہ سورۂ کہف کی یہ آیت ہے:

﴿ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ﴾ [الكهف : ٥٠]

''یاد کرو جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا، وہ جنوں میں سے تھا اس لیے اپنے رب کے حکم کی اطاعت سے نکل گیا۔''

اس آیت میں ابلیس کو جن قرار دیا جا رہا ہے۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوا کہ سات مقامات پر ابلیس کا ذکر فرشتوں کے ضمن میں ہو رہا ہے اور پھر ایک مقام پر اسے جن قرار دیا جا رہا ہے تو کیا یہ تضاد اور اختلاف نہیں ہے؟

بات یہ ہے کہ ہم انگریزی تراجم پڑھتے ہیں اور ان کی مدد سے قرآن کو سمجھتے ہیں لیکن قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تھا۔ اور عربی زبان کا ایک قاعدہ ہے جسے ''تغلیب'' کہتے ہیں۔ تغلیب سے مراد ہوتی ہے کہ جب آپ اکثریت کا ذکر کرتے ہیں تو اقلیت بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ یعنی جب آپ لوگوں کی اکثریت سے خطاب کریں گے تو اقلیت کو شامل

سمجھا جائے گا۔ مثال کے طور پر فرض کیجیے ایک جماعت میں سو طالب علم ہیں۔ جن میں سے ننانوے لڑکے ہیں اور ایک لڑکی۔ اب اگر میں عربی میں انھیں کہوں:

''لڑکو، کھڑے ہو جاؤ۔''

تو وہ لڑکی بھی کھڑی ہو جائے گی کیوں کہ وہ تغلیب کے اصول کو سمجھتی ہو گی۔ لیکن اگر میں انگریزی میں کہوں کہ؛

" All boys, Stand up."

تو صرف لڑکے کھڑے ہوں گے، لڑکی بیٹھی رہے گی۔ کیوں کہ انگریزی زبان میں تغلیب کا اصول موجود نہیں ہے۔

لہٰذا بات یہ ہے کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تھا۔ اور عربی زبان میں جب فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ اکثریت فرشتوں کی تھی۔ ابلیس جن تھا یا فرشتہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیوں کہ حکم سب کے لیے تھا۔

ان تمام آیات میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی جائے گی کہ وہ جن تھا یا فرشتہ؟ کیوں کہ تغلیب کے قاعدے کی رو سے حکم سب کو ملا تھا۔ اور سب کے لیے اس پر عمل کرنا ضروری تھا۔ لیکن سورۂ کہف کی بیسویں آیت میں بتا دیا گیا کہ وہ ایک جن تھا۔

دوسری بات یہ کہ فرشتے اپنی مرضی کے مالک نہیں ہوتے۔ انھیں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے ہر حکم پر بلا چون و چرا عمل پیرا ہونا ہوتا ہے۔

جب کہ جن ایک صاحب ارادہ مخلوق ہے۔ لہٰذا اس سے بھی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ ایک جن ہی تھا۔ مجھے اُمید ہے، آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہو گا۔

سوال:...... اگر ہم یہ یقین رکھتے ہیں خدا ما فوق الفطرت ہے اور سب کچھ کرنے پر قادر ہے تو پھر وہ انسانی صورت کیوں اختیار نہیں کر سکتا؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بہن نے سوال پوچھا ہے کہ خدا ما فوق الطفرت ہے اور سب کچھ کرنے پر قادر ہے تو پھر سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی صورت کیوں نہیں اختیار

کرسکتا؟ وہ لوگ جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ خدا مافوق الفطرت ہے۔ عموماً جتنے بھی لوگ خدا کو مانتے ہیں سب ہی یہ بات کرتے ہیں کہ خدا مافوق الفطرت ہے۔ سب سے پہلے تو میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا واقعی خدا مافوق الفطرت ہے۔ خدا کو مافوق الفطرت Super Natural کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ خدا ایک چیز ہے اور فطرت ایک دوسری چیز جس پر خدا فوقیت رکھتا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ قرآن کے بیان کردہ تصور خدا کے مطابق خدا کو مافوق الفطرت نہیں کہنا چاہیے۔ کیوں کہ فطرت تو خدا کی مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے جس نے فطرت کو خلق فرمایا ہے۔ لہٰذا یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ فطرت کچھ کہے اور خدا کچھ اور کہے۔

آپ کی فطرت یعنی فطرتِ انسانی بھی اللہ تعالیٰ ہی کی تخلیق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی میں سے ایک ''فاطر'' بھی ہے۔ یہ قرآنِ مجید کی پینتیسویں سورۃ کا نام بھی ہے۔ فاطر کا لفظ فطرت ہی سے نکلا ہے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے تخلیق کرنے والا، بنانے والا، فطرت عطا کرنے والا، مخلوقات کی اصل فطرت وضع کرنے والا۔

اسی طرح رمضان المبارک میں ہم مغرب کے وقت روزہ افطار کرتے ہیں یعنی روزہ توڑتے ہیں۔ افطار کا مطلب ہے روزہ توڑنا۔ فاطر کا مطلب ہے خالق۔ اشیا کو بنانے والا، صورت عطا کرنے والا، فطرت عطا کرنے والا۔

قرآن لوگوں سے کہتا ہے کہ مظاہر فطرت پر غور کرو، سورج اور چاند کی گردش پر غور کرو یہ سب قوانین فطرت کی پابندی کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی اپنے مدار سے باہر نہیں جاتا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا تصور بھی عین فطری ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ ﴾ [الاحزاب: ٦٢]

''اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔''

اسی طرح کا پیغام قرآن مجید میں کئی اور مقامات پر بھی دیا گیا ہے۔ سورۂ روم میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد پاک ہے:

﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ﴾

[الروم : ۳۰]

”قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں کی جا سکتی۔“

آج کوانٹم فزکس اور جدید ترین سائنس ہمیں بتاتی ہے کہ کسی دیکھنے والے کے بغیر کسی شے کا وجود کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ کائنات بھی لایعنی ہے اگر اس پر نظر رکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ایک نام الشہید بھی ہے یعنی گواہ۔ یعنی خدا مافوق الفطرت نہیں ہے بلکہ فطری ہے۔ جہاں تک سوال کے دوسرے حصے کا تعلق ہے، کہ خدا اگر سب کچھ کرنے پر قادر ہے تو وہ انسانی صورت کیوں اختیار نہیں کر سکتا؟

اس بات کو سمجھانے کے لیے میں خدا پر ایمان رکھنے والوں سے ایک سوال کیا کرتا ہوں تا کہ اللہ تعالیٰ کا تصور ان کے لیے واضح تر ہو سکے، میں پوچھتا ہوں کہ کیا خدا ہر شے کو پیدا کر سکتا ہے؟

اور ان کا جواب ہوتا ہے کہ ہاں اللہ تعالیٰ ہر چیز پیدا فرما سکتا ہے۔

پھر میں پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ تعالیٰ ہر چیز کو فنا کرنے پر قادر ہے؟

ان کا جواب ہوتا ہے:

ہاں، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو فنا کر سکتا ہے۔

میرا تیسرا سوال ہوتا ہے:

کیا اللہ تعالیٰ کوئی ایسی چیز بنا سکتا ہے جسے وہ فنا نہ کر سکے؟

اور یہاں وہ پھنس جاتے ہیں۔ اگر وہ جواب ہاں میں دیتے ہیں کہ خدا کوئی ایسی چیز بنا سکتا ہے جسے وہ فنا نہ کر سکے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے دوسرے بیان کی نفی کر رہے ہیں یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو فنا کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ جواب نفی میں دیتے ہیں، اگر وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسی شے نہیں بنا سکتا جسے وہ فنا نہ کر سکے تو وہ اپنے پہلے بیان کی تردید کرتے

ہیں یعنی یہ کہ اللہ ہر چیز بنا سکتا ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ منطقی انداز میں نہیں سوچ رہے ہوتے۔ بہت سے کام ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ ایک طویل القامت پست قد آدمی نہیں بنا سکتا۔ آدمی یا تو طویل قامت ہوگا یا پست قد اللہ تعالیٰ پست قامت کو طویل کرسکتا ہے لیکن پھر وہ پست قد نہیں رہے گا۔ وہ طویل قامت کو پست قد کرسکتا ہے لیکن پھر وہ طویل نہیں رہے گا یا وہ اس کا قد درمیانہ کرسکتا ہے جو پست ہوگا نہ طویل لیکن وہ ایک انسان کو طویل القامت بونا نہیں بنا سکتا۔

میں ایسے ہزارہا کاموں کی فہرست بنا سکتا ہوں جو اللہ تعالیٰ نہیں کرسکتا۔

اللہ تعالیٰ ناانصافی نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ یہ تمام کام نہیں کرسکتا کیوں کہ خدا ہونے کا مطلب یہی ہے کہ وہ یہ سب کام نہیں کرسکتا۔ وہ بھول نہیں سکتا، وہ ظلم نہیں کرسکتا۔

پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے مارسکتا ہے، فنا کرسکتا ہے، ختم کرسکتا ہے لیکن کسی ایسی جگہ نہیں بھیج سکتا جہاں اس کا حکم نہ چلتا ہو۔ وہ مجھے فنا کرسکتا ہے لیکن اپنی خدائی سے باہر نہیں نکال سکتا۔ کیوں کہ سب کچھ اسی کا ہے سب کچھ اس کی خدائی میں ہے۔

قرآن کہیں یہ نہیں کہتا کہ اللہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ ﴾

”بے شک اللہ تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔“

قرآن بتاتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، کوئی شے ایسی نہیں جو اس کی قدرت سے باہر ہو۔ یہ بات قرآن میں متعدد مقامات پر کہی گئی ہے، بار بار دہرائی گئی ہے، سورۂ بقرہ میں، سورۂ آل عمران میں، سورۂ فاطر میں اور متعدد دیگر آیات میں فرمایا گیا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ ﴾

کہیں بھی یہ نہیں فرمایا گیا کہ اللہ ہر کام کرسکتا ہے اور ان دونوں باتوں میں کہ

”اللہ ہر کام کرسکتا ہے“ اور

''اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''

زمین و آسمان کا فرق ہے۔

بلکہ قرآنِ مجید میں تو ارشاد ہوتا ہے:

﴿ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ۝ ﴾ [البروج: ١٦]

''وہ جو کچھ چاہے کر ڈالنے والا ہے۔''

یعنی وہ جو کچھ چاہتا ہے، جس بات کا ارادہ کرتا ہے، وہی کرتا ہے۔ وہ ارادہ کس کام کا کرتا ہے اللہ، صرف افعال الٰہیہ ہی کا ارادہ فرماتا ہے۔ خدائی کام ہی کرتا ہے۔ ایسے کام نہیں کرتا جو اس کے مرتبہ سے فروتر ہوں۔

جہاں تک آپ کے بنیادی سوال کا تعلق ہے، تو وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی صورت کیوں اختیار نہیں کرسکتا؟

خدا کے انسانی صورت اختیار کرنے کا فلسفہ'' حلول'' کہلاتا ہے اور اس فلسفے کے ماننے والوں نے اپنی ایک بظاہر خوبصورت منطق وضع کر رکھی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی ہدایت کے لیے، ان کے دکھ درد اور مسائل کو سمجھنے کے لیے انسانی صورت اختیار کرتا ہے تاکہ وہ جان سکے کہ جب آپ دکھی ہوتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں، جب آپ خوش ہوتے ہیں تو کیا محسوس کرتے ہیں؟ اور اس طرح وہ انسانیت کے لیے اوامر و نواہی وضع فرماتا ہے۔ یہ عقیدۂ حلول ہے۔

لیکن اگر آپ تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ منطق بالکل کمزور ہے۔ فرض کیجیے میں کسی شے کا خالق ہوں۔ فرض کیجیے میں ایک ٹیپ ریکارڈر یا ٹیلی ویژن ایجاد کرتا ہوں۔ اب یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس ٹیپ ریکارڈر یا ٹی وی کے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا، مجھے خود ٹیپ ریکارڈر یا ٹی وی بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مجھے صرف یہ کرنا ہوگا کہ ایک ہدایتی کتابچہ لکھ دوں کہ اس ٹیپ ریکارڈر کو استعمال کرنے کا طریقہ کار کیا ہے؟ اس میں کیسٹ کس طرح ڈالی جائے گی اور کون سا بٹن دبانے

سے یہ چل پڑے گا؟ کون سا بٹن دبانے سے رک جائے گا۔ یہ بٹن دبائیں تو فارورڈ ہوگا، فلاں بٹن دبائیں تو ریوائنڈ ہوگا۔

اسی طرح انسانوں کی ہدایت کے لیے خدا کو خود انسان بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انسانوں کو ان کا بھلا برا بتانے کے لیے وہ صرف یہ کرتا ہے کہ انھی میں سے ایک شخص کو منتخب کرتا ہے اور اس کے ذریعے انھیں ہدایتی کتابچہ فراہم کر دیتا ہے۔

یہ کتابچہ کیا ہے؟ قرآنِ مجید ہی وہ ہدایت نامہ ہے جس کے ذریعے انسانیت کو اوامر و نواہی کا علم دیا گیا ہے۔ انھیں بتا دیا گیا ہے کہ ان کے حق میں کیا اچھا ہے اور کیا برا؟ قرآن کے ذریعے انھیں مکمل ہدایت فراہم کر دی گئی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کو انسانی صورت اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

آپ پوچھتے ہیں:

”کیا خدا انسانی صورت اختیار کر سکتا ہے؟“

میں کہتا ہوں، ہاں، کر سکتا ہے لیکن جس وقت وہ انسانی صورت میں آئے گا وہ خدا نہیں رہے گا۔ کیوں کہ انسان فانی ہے اور خدا لافانی۔ کوئی بیک وقت فانی اور لافانی کس طرح ہو سکتا ہے؟

اسی طرح انسانوں کی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر انھیں کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے اور قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

﴿ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ ﴾ [الانعام: ۱٤]

”کہو، اللہ کو چھوڑ کر کیا میں کسی اور کو اپنا سرپرست بنالوں؟ اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا مالک ہے جو روزی دیتا ہے، روزی لیتا نہیں ہے۔“

روزی اور خوراک کی ضرورت تمام انسانوں کو ہوتی ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت ہے؟ ہرگز نہیں۔

اسی طرح انسان کو نیند کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ط ﴾

[البقرہ: ۲۵۵]

اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔''

انسان کو سونے کی بھی ضرورت پڑتی ہے اور آرام کی بھی۔ اسے کھانے کی بھی حاجت ہوتی ہے اور پینے کی بھی۔ جس وقت آپ خدا کے انسانی صورت میں آنے کی یا مافوق الفطرت ہونے کی بات کرتے ہیں تو گویا آپ ملحد اور دہریے کے ہاتھ میں وہ چھڑی دے دیتے ہیں جس سے وہ آپ کو پیٹ سکتا ہے۔

لہٰذا خدا مافوق الفطرت نہیں، عین فطری ہے اور وہ انسانی صورت اختیار نہیں کرسکتا۔

اُمید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال:...... میں ایک عیسائی ہوں۔ میرا سوال یہ ہے کہ اسلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہ تسلیم کرتا ہے کہ انھیں آسمان پر اٹھالیا گیا تھا۔ جب کہ حضرت محمد ﷺ کے بارے میں ایسا عقیدہ نہیں رکھا جاتا۔ اسی طرح مسلمان یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام معجزانہ طور پر بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ کیا اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اگر حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام خدا نہیں ہیں تو پھر بھی وہ حضرتِ محمد ﷺ سے افضل ضرور ہیں۔ تو آپ اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کیوں پیش نہیں کرتے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بھائی نے ایک بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ لیکن اس قسم کے سوال عموماً مشنریوں کی جانب سے، مسیحی مبلغین کی جانب سے پوچھے جاتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ یہ بھائی ایک مبلغ ہیں یا نہیں لیکن اس قسم کے سوالات عموماً وہی کرتے ہیں۔ انھوں نے دو تین مثالیں دیں۔ مثال کے طور پر یہ کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا تھا یا یہ کہ ان کی پیدائش ایک معجزے کے طور پر بغیر باپ کے ہوئی تھی۔ جب کہ

حضرتِ محمد مصطفیٰ ﷺ کو آسمان پر بھی نہیں اٹھایا گیا۔ ان کے والد بھی تھے اور والدہ بھی۔

اس قسم کے سوالات کے بعد وہ پوچھتے ہیں کہ افضل کون ہے؟ بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام۔ اسی طرح پوچھا جاتا ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر نام لے کر قرآنِ مجید میں ۲۵ مرتبہ کیا گیا ہے۔ جب کہ حضرتِ محمد ﷺ کا صرف پانچ مرتبہ۔ تو افضل کون ہے؟ اور ہمارے ذہن میں خیال آتا ہے کہ اس طرح تو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام ہی افضل ہیں۔

تو بھائی! آپ چاہتے ہیں کہ میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے بات کروں۔ تو بات یہ ہے کہ اسلام وہ واحد غیر عیسائی مذہب ہے، جو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کو تسلیم کرتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ایمان کی شرط ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کو تسلیم کیا جائے۔ ہم ان کی بغیر باپ کے پیدائش پر بھی یقین رکھتے ہیں حالاں کہ دورِ حاضر کے بہت سے عیسائی بھی اس بات پر ایمان نہیں رکھتے۔

ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے، اللہ کے حکم سے اندھوں کو بینا کر دیا کرتے تھے۔

لیکن یہاں ہماری راہیں الگ ہو جاتی ہیں۔ ہم حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ہرگز نہیں سمجھتے۔ اور نہ ہی ہم انھیں خدا کا بیٹا سمجھتے ہیں۔ ہم انھیں اللہ تعالیٰ کا پیغمبر مانتے ہیں۔

اب ہم آپ کے سوال کی طرف آتے ہیں کہ اگر قرآن یہ بتاتا ہے کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا تھا جب کہ حضرتِ محمد ﷺ کو آسمان پر نہیں اٹھایا گیا تو پھر دونوں میں سے افضل کون ہے؟..........

قرآن میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے فرمایا گیا ہے:

﴿ يَٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ ﴾

[النسآء: ۱۷۱]

”اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی

بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا۔''

اس آیت مبارکہ میں اہل کتاب کو غلو سے منع کیا گیا ہے۔ کون سے غلو سے؟ ایک طرف یہود تھے جو حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت ہی کا انکار کر رہے تھے اور انھیں جھوٹا کہہ رہے تھے۔ جب کہ عیسائی انھیں خدا قرار دے رہے تھے۔ دونوں طرف انتہا پسندی تھی۔

خدا صرف ایک ہی ہے۔ رفع مسیح کا سبب غلط فہمی رفع کرنا تھا۔ ان کی آمد ثانی بطورِ رسول کے نہیں ہوگی۔ وہ ہمیں نئی تعلیمات دینے کے لیے نہیں آئیں گے۔

سورۂ مائدہ میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ [المائدہ: ۳]

''آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے۔ اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے۔ اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔''

ہم مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ دوبارہ تشریف لائیں گے۔ لیکن وہ کوئی نئی تعلیم نئی شریعت دینے کے نہیں آئیں گے۔ بلکہ وہ خود فرمائیں گے:

''یا باری تعالیٰ، تو گواہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کو کبھی اپنی پرستش کرنے کا حکم نہیں دیا۔ میں نے انھیں کبھی نہیں کہا کہ مجھے خدا کا بیٹا سمجھیں۔''

درحقیقت وہ عیسائیوں ہی کے لیے تشریف لائیں گے مسلمانوں کے لیے نہیں۔

دوسری بات آپ کرتے ہیں ان کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کے حوالے سے۔ اگر آپ اس وجہ سے انھیں خدا قرار دیتے ہیں کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے تو اس بات کا جواب قرآن اِن الفاظ میں دیتا ہے:

﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ

كُنْ فَيَكُوْنُ ○ ﴾[آل عمران : ۵۹]

''اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے۔ کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔''

کیا حضرتِ آدم علیہ السلام کا کوئی باپ تھا؟

نہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کا باپ نہیں تھا۔ بلکہ ان کی ماں بھی نہیں تھی۔ اگر اس بنیاد پر آپ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا قرار دیتے ہیں تو پھر حضرتِ آدم علیہ السلام کو ان سے بڑا خدا قرار دینا چاہیے۔ (نعوذ باللہ)

انجیل تو ایک اور غیر معمولی انسان King Malchisedec کا بھی ذکر کرتی ہے، جس کا نہ کوئی آغاز تھا اور نہ اختتام۔

جہاں تک سوال ہے قرآنِ مجید میں حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر پچیس مرتبہ ہونے کا اور حضرتِ محمد رسول اللہ ﷺ کا ذکر صرف پانچ مرتبہ ہونے کا تو اس کی وجوہات بھی بالکل واضح ہیں۔ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام پر (یہودیوں کی طرف سے) الزامات تھے جب کہ نبی کریم ﷺ پر کوئی الزام نہیں تھا جس کا جواب دیا جانا ضروری ہوتا۔ جب قرآن نازل ہو رہا تھا تو حضرتِ محمد ﷺ خود وہاں موجود تھے۔ جو شخص آپ کے سامنے موجود ہو اس کو بار بار مخاطب کرنے یا اس کا نام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن جو دوست موجود نہ ہو اس کا ذکر آپ ہر بار نام لے کر کریں گے۔

لہٰذا حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام چوں کہ اس وقت موجود نہیں تھے، جب قرآن نازل ہو رہا تھا، لہٰذا ان کا ذکر ہر بار نام لے کر کیا گیا۔ اور اگر یہی معیار ہے تو پھر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا ذکر تو ۱۳۲ مرتبہ کیا گیا ہے تو کیا وہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام اور حضرتِ محمد ﷺ دونوں سے افضل ہیں؟ نہیں۔ بلکہ وجہ صرف یہ ہے کہ چوں کہ وہ موجود نہیں تھے، لہٰذا ان کا ذکر ہر بار نام لے کر کیا جانا ضروری تھا۔

اُمید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال:...... میرا سوال یہ ہے کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا کہ ماں کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی؟ حالاں کہ آج ایسے جدید طریقہ ہائے کار دریافت ہو چکے ہیں جن کی مدد سے بآسانی بچے کی جنس معلوم ہوسکتی ہے۔ اس صورتِ حال کی آپ کیا وضاحت فرمائیں گے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک:...... بہن نے سوال پوچھا ہے کہ قرآن کے مطابق اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ رحم میں پلنے والے بچے کی جنس کیا ہے؟ میں ان کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ آج ایسے کئی جدید ٹیسٹ دریافت ہو چکے ہیں جن کی مدد سے بچے کی جنس معلوم کی جاسکتی ہے۔ تو کیا یہ ایک غلطی ہے؟

بہن قرآنِ مجید کی جس آیت کی طرف اشارہ کر رہی ہے وہ سورۂ لقمان کی ایک آیت ہے۔ اس آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّا ذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ [لقمٰن: ٣٤]

''اُس گھڑی کا (قیامت) علم اللہ ہی کے پاس ہے، وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا پرورش پا رہا ہے۔ کوئی متنفس یہ نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرنے والا ہے اور نہ کسی شخص کو یہ خبر ہے کہ کس سرزمین میں اس کو موت آنی ہے۔ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔''

اس آیت مبارکہ میں بتایا گیا ہے ان پانچ باتوں کا علم سوائے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے کسی کو نہیں ہے۔ جہاں تک بچے کی جنس کے حوالے سے آپ کے سوال کا تعلق ہے تو بات یہ ہے یہ محض غلط فہمی ہے جس کی وجہ تراجم خصوصاً بعض اُردو تراجم ہیں۔ جن میں اس آیت کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی بچے کی جنس کے بارے میں نہیں جانتا۔ آیت میں جنس کا ذکر ہی نہیں ہے۔ قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا کہ رحم

میں کیا ہے؟ قرآن بچے کی جنس کے حوالے سے بات نہیں کر رہا بلکہ اس بچے کے کردار اور شخصیت کے حوالے سے بات کر رہا ہے۔ کیا وہ بچہ نیک ہوگا، ایمان دار ہوگا یا بے ایمان؟ وہ معاشرے کے لیے کیا کردار ادا کرے گا؟ وہ انجینئر بنے گا؟ ڈاکٹر بنے گا؟ اور یقین کیجیے اپنے تمام تر علم طب اور سائنسی معلومات کے باوصف یہ باتیں آج بھی وقت سے پہلے کوئی نہیں بتا سکتا۔ لہٰذا یہ محض غلط تراجم سے پیدا ہونے والی غلط فہمی ہے۔ آپ لغات دیکھ سکتے ہیں۔ ایسی لغات بھی ہیں جو غیر مسلموں کی مرتبہ ہیں۔ ان میں سے Lane Lexicon سب سے زیادہ مشہور ہے۔ آپ ان کی مدد سے خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان آیاتِ مبارکہ میں جنس کا ذکر موجود ہی نہیں ہے۔

اس آیت میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ یہ بھی سوائے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے کسی کے علم میں نہیں ہے کہ قیامت کب آئے گی۔ ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے قیامت آنے کی پیش گوئیاں کیں۔ مثال کے طور پر نومبر ۱۹۹۲ء میں ٹائمز آف انڈیا اخبار میں یہ خبر آئی کہ کوریا کے کسی چرچ نے یہ اعلان کیا کہ دنیا نومبر ۱۹۹۲ء میں ہی ختم ہو جائے گی۔

اس چرچ سے وابستہ تمام لوگ مذکورہ تاریخ کو اس چرچ میں جمع ہوئے لیکن ہوا کیا؟ کچھ بھی نہیں۔ دنیا آج بھی قائم ہے اور قیامت کی پیش گوئی کرنے والے لوگوں کے پیسے لے کر فرار ہو گئے۔

اسی طرح بارش کا معاملہ ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آج محکمہ موسمیات وقت سے پہلے ہی بارش کی پیش گوئی کرسکتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ یہ پیش گوئیاں کس حد تک درست ہوتی ہیں خصوصاً انڈیا میں۔

لیکن ہوسکتا ہے بعض لوگ کہیں کہ ترقی یافتہ ممالک مثلاً امریکہ میں یہ پیش گوئیاں درست ہوتی ہیں۔ چلیے ہم ان کی بات مان لیتے ہیں۔ فرض کر لیتے ہیں کہ وہاں واقعی اطلاعات درست ہوتی ہیں لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ محکمہ موسمیات بارش کی پیش گوئی کس طرح کرتا ہے؟ اس کے لیے بادلوں کی موجودگی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پھر ہوا کا رخ دیکھا

جاتا ہے۔ اور یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے کیوں کہ اس صورت میں بارش تو بادلوں میں موجود ہوتی ہے۔صرف برسنے کا اندازہ لگانا ہوتا ہے۔

یہ تو ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی طالب علم امتحان دے، جس کا نتیجہ ایک ماہ بعد آنا ہو۔ تین ہفتے بعد وہ استاد جس نے پرچے چیک کیے ہیں وہ پیش گوئی کرے کہ فلاں طالب علم اوّل آئے گا۔ اس میں کوئی خوبی نہیں کیوں کہ پرچے چیک کرنے کی وجہ سے اسے وہ معلومات پہلے ہی حاصل ہوگئی ہیں جو دوسرے لوگوں کو ایک ہفتے بعد حاصل ہوں گی۔

بات تو جب ہے کہ محکمۂ موسمیات کسی خاص علاقے کے بارے میں بغیر بادلوں کو دیکھے یہ بتائے کہ ۲۰۰ سال بعد وہاں بارش ہوگی یا نہیں؟ میں چیلنج کرتا ہوں کوئی بھی محکمہ موسمیات دوسوسال کی پیش گوئی کرے کہ دنیا میں کہاں کتنی بارش ہوگی اور وہ کبھی ایسا نہیں کرسکیں گے۔

اس کے بعد موت کا معاملہ آتا ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک خودکشی کرنے والا یہ بتا سکتا ہے کہ وہ کہاں اور کس وقت مرے گا لیکن ہم جانتے ہیں کہ خودکشی کی کوشش کرنے والوں کی اکثریت ناکام ہوجاتی ہے۔ دنیا میں کتنے فی صد لوگ خودکشی کی کوشش کرتے ہیں؟ ایک انتہائی معمولی اور ناقابل ذکر تعداد۔ اوران کی اکثریت بھی اپنی کوشش میں ناکام ہوجاتی ہے۔ کچھ لوگ زہر کھاتے ہیں اور پھر کسی کو بتا دیتے ہیں۔ انھیں ہسپتال پہنچایا جاتا ہے اوران کی جان بچالی جاتی ہے۔

اگر آپ کہیں سے چھلانگ مارتے ہیں تو پھر بھی یہ ضروری نہیں کہ آپ مرنے میں کامیاب ہو ہی جائیں۔ اگر اللہ آپ کو بچانا چاہے تو پھر بھی بچا سکتا ہے۔ اور اگر آپ مرجاتے ہیں تو پھر بھی آپ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ اللہ کی مرضی سے ہی مرتے ہیں۔

اور جہاں تک آخری بات کا تعلق ہے کہ کسی کو یہ علم نہیں کہ وہ کیا کمائے گا تو اس کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ بھائی ذاکر مجھے تو پتہ ہے کہ میں دو ہزار روپے کماؤں گا۔ میری ماہانہ آمدن دو ہزار روپے ہے۔ تو کیا قرآن کا بیان غلط ہے؟

نہیں، کیوں کہ قرآن آپ کی معاشی آمدن کے بارے میں بات نہیں کر رہا۔ دنیاوی کمائی کا ذکر نہیں کر رہا۔ یہاں لفظ ''تکسب'' استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد اچھے برے اعمال بھی ہوتے ہیں۔ اور جہاں تک نیک اعمال کا تعلق ہے وہ اگر آپ کرتے بھی ہیں تو آپ کو یہ علم تو نہیں ہوسکتا کہ آپ کتنا ثواب کما رہے ہیں؟

اسی طرح اگر آپ سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو پھر بھی آپ یہ نہیں جانتے کہ اس کی آپ کو کتنی سزا ملے گی۔ ان تمام باتوں کا حساب اللہ ہی کے پاس ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا۔

سوال :...... ارون شوری نے اسلام کے خلاف متعدد مضامین اور کتابیں لکھی ہیں۔ آپ انھیں چیلنج یعنی عوامی مناظرے کا چیلنج کیوں نہیں دیتے؟

ڈاکٹر ذاکر نائیک :...... سوال پوچھا گیا ہے کہ میں ارون شوری کو مناظرے کا چیلنج کیوں نہیں دیتا، جس نے اسلام کے خلاف کتابیں لکھی ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں یہ تحریر پڑھ چکا ہوں۔ اس کے بیش تر مقالات کا تعلق دو نکات سے ہوتا ہے۔ ایک تو وہ خواتین کے حوالے سے بات کرتا ہے کہ اسلام خواتین کو مساوی حقوق نہیں دیتا اور دوسرے وہ یہ کہتا ہے کہ اسلام ایک دہشت گرد مذہب ہے۔ یہ ایک بے رحم اور ظالم مذہب ہے۔ اور اس کے علاوہ کچھ ادھر ادھر کی باتیں جیسا کہ ایک بھائی نے سوال پوچھا تھا کہ کیا (نعوذ باللہ) خدا ریاضی نہیں جانتا؟ ہم ان باتوں کا تجزیہ کر سکتے ہیں اور یقین کیجیے اس کی تمام باتیں سیاق و سباق کو نظر انداز کر کے، غلط حوالوں اور غلط ترجموں کو بنیاد بنا کر کے کی گئی ہیں۔ میں ان تمام باتوں کی وضاحت کرسکتا ہوں اور کر رہا ہوں۔

اگر آپ اس کی تازہ ترین کتاب (World of Fatwas, Shariah in Action.) کا جائزہ لیں جو کچھ ہی دن پہلے بمبئی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے سرورق پر قرآنِ مجید کی آیت درج کی گئی ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ

بَيْنَهُمْ ۖ﴾ [الفتح : ٢٩]

''محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔''

یہاں بھی اس نے وہی کام کیا ہے کہ سیاق وسباق سے الگ کر کے ایک بات پیش کر دی ہے اور تاثر یہ پیش کرنا چاہا ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کے حق میں بے رحم ہیں۔ اگر آپ اس آیت کو درست سیاق وسباق میں پڑھنا چاہیں تو یہ بات آیت نمبر ۲۵ سے شروع ہو رہی ہے۔ اور فرمایا جا رہا ہے کہ وہ لوگ، کفار جنھوں نے مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے اور قربانی کرنے سے روکا، ان کے حق میں مسلمان سخت ہیں۔ یہاں ذکر ان کفار کا ہو رہا ہے جنھوں نے مسلمانوں کو حج کا فریضہ ادا کرنے سے روکا تھا، آپ خود بتائیے کہ اگر آج کوئی عیسائیوں کو ویٹیکن سٹی میں داخل ہونے سے روکے تو عیسائی اسے اچھا سمجھیں گے یا برا؟

یا فرض کیجیے کوئی ایک ہندو کو بنارس میں داخل ہونے سے روک دے تو کیا وہ ہندو اس روکنے والے کو پسند کرے گا؟

قدرتی بات ہے کہ وہ اسے ناپسند کرے گا۔ یہاں بھی اگر آپ سیاق وسباق کو ملحوظ رکھ کر مطالعہ کریں تو یہی بات کی جا رہی ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے مسلمانوں کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے اور حج کا فریضہ ادا کرنے سے روکا ہے مسلمانوں کو ان کے حق میں سخت اور آپس میں نرم خو ہونا چاہیے۔

اس کتاب کے صفحہ ۷۱ اور ۲۷۵ پر وہ اپنی پسندیدہ آیت کا حوالہ دیتا ہے۔ یہ سورۂ توبہ کی پانچویں آیت ہے، جس کا حوالہ وہ بار بار دیتا ہے:

﴿ فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ ﴾

[التوبہ : ۵]

''پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو، جہاں پاؤ اور انھیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انھیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

یہاں بھی وہی معاملہ ہے کہ بات سیاق وسباق سے الگ کر کے کی جا رہی ہے۔ یہاں بات سورۂ توبہ کی پہلی آیت سے شروع ہو رہی ہے۔ اور ان مشرکینِ مکہ کا ذکر کیا جا رہا ہے جنھوں نے مسلمانوں سے ایک امن معاہدہ کیا تھا اور پھر یک طرفہ طور پر معاہدہ توڑ دیا۔ معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ لہٰذا یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں واضح انتباہ کر دیا گیا کہ یا تو چار ماہ کے دوران معاملات سیدھے کر لو اور یا جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور مسلمانوں کو کہا گیا کہ جنگ کے دوران انھیں جہاں پاؤ قتل کر دو۔

فرض کیجیے امریکہ اور ویت نام کی لڑائی کے دوران امریکہ کا صدر اپنے فوجیوں کو کہتا ہے کہ دورانِ جنگ دشمنوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور میں آج یہ بات آپ کے سامنے اس طرح کرتا ہوں کہ؛

''امریکی صدر کہتا ہے کہ ویت نامیوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔''

تو یقیناً امریکہ کا صدر آپ کو قصائی ہی لگے گا۔ لیکن جنگ کے تناظر میں کوئی بھی جرنیل یا سربراہ حکومت یہی کہے گا کہ ڈرو مت اور اپنے دشمنوں کو قتل کرو۔ وہ اسی طرح ان کا حوصلہ بلند رکھ سکتا ہے۔ پھر پانچویں آیت کے بعد وہ سیدھا ساتویں اور آٹھویں آیت پر پہنچ جاتا ہے۔ چھٹی آیت کو نظر انداز کر دیتا ہے، کیوں؟

اس لیے کہ اس آیت میں اس کے اعتراض کا جواب موجود ہے۔ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دو۔ اور پھر اسے محفوظ جگہ تک پہنچا دو۔ اگر وہ اسلام قبول نہ بھی کریں، پھر بھی جس مشرک نے پناہ مانگی ہے، اسے امن کی جگہ تک پہنچاؤ۔

آج کون سا جرنیل اپنے فوجیوں کو یہ ہدایت دے سکتا ہے کہ اگر دشمن پناہ مانگے تو اسے محفوظ مقام پر پہنچا کر بھی آؤ۔ محض معاف کرنے یا چھوڑ دینے کی بات بھی نہیں ہو رہی بلکہ بحفاظت مقامِ امن تک پہنچانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آج کون سی فوج، کون سا جرنیل یہ حکم دے سکتا ہے؟

لیکن قرآن یہی حکم دے رہا ہے۔

لیکن اپنے محبوب موضوع یعنی مسلمانوں کو ظالم ثابت کرنے کے لیے ارون شوری اسی طرح سیاق وسباق سے ہٹ کر حوالے پیش کرتا ہے۔

اس کا دوسرا پسندیدہ موضوع ''خواتین کے حقوق'' ہے اور یہاں بھی آیات کے حوالے دیتا ہے۔ اور یہ وہی آیات ہیں جن کا حوالہ تسلیمہ نسرین جیسے لوگ دیتے ہیں۔

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں ارون شوری سے مباحثہ کیوں نہیں کرتا؟

میں نے ایک دفعہ تسلیمہ نسرین کے حوالے سے ہونے والے ایک مباحثے میں شرکت کی تھی جس کا اہتمام ''بمبئی یونین آف جرنلسٹس'' نے کیا تھا۔ جب میں نے اس مباحثے کی وڈیو ریکارڈنگ کی اجازت مانگی تو مجھے اجازت نہیں دی گئی۔ حالاں کہ اس مباحثے کا عنوان تھا:

''کیا مذہبی انتہا پسندی آزادئ اظہار کی راہ میں رکاوٹ ہے؟''

یعنی عنوان تو آزادئ اظہار ہے لیکن مجھے وہ گفتگو ریکارڈ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی، کیا یہ منافقت نہیں ہے؟ میں نے انھیں کہا کہ وہ بھی اس ریکارڈنگ کی کاپی رکھ سکتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اجازت نہیں دینا چاہتے تھے۔ بالآخر خاصی بحث وتمحیص کے بعد مجھے اس مباحثے کو ریکارڈ کرنے کی اجازت ملی اور آپ جانتے ہیں کیا ہوا؟

ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے میں انتہائی کامیاب رہا۔ وہ لوگ اسلام کو قربانی کا بکرا بنانا چاہتے تھے، ذاکر نائیک کو قربانی کا بکرا بنانا چاہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مباحثہ انتہائی کامیاب رہا۔ اس میں میری ذاتی قابلیت کا کوئی دخل نہیں تھا محض اللہ کا کرم تھا کہ میں کامیاب رہا اور اتنا کامیاب رہا کہ کسی ایک اخبار نے بھی اس مباحثے کی خبر نہیں

لگائی۔

عیسائیوں کی طرف سے اس مباحثے پر فادر پریرا موجود تھے۔ ہندوؤں کی نمائندگی ڈاکٹر ویدویاس کر رہے تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے میں تھا اور تسلیمہ نسرین کی کتاب کا مراٹھی ترجمہ کرنے والے اشوک صاحب بھی مباحثے میں شریک تھے۔ اگر اس مباحثے کی ریکارڈنگ نہ کی جاتی تو بھلا کس کو اس کے بارے میں پتہ چلتا؟ لیکن آج صرف بمبئی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں لاکھوں لوگ یہ ریکارڈنگ دیکھ چکے ہیں۔

اور ارون شوری کے اس حوالے سے تمام اعتراضات کے جوابات بھی ایک کیسٹ میں موجود ہیں۔ اس کیسٹ کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں میری گفتگو ہے اور دوسرے حصے میں سوالات کے جوابات ہیں۔ [1] اور ان میں وہ سوالات بھی شامل ہیں جو ارون شوری اٹھاتا ہے۔

رہا سوال ارون شوری کے ساتھ مناظرے کا۔ تو کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کے ساتھ مباحثہ کیا جائے؟ وہ ہرگز اس قابل نہیں ہے۔ لیکن میں اس کے ساتھ کسی بھی وقت مناظرہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ آئے .... اھلاً وسھلاً

شرط یہی ہوگی کہ یہ مناظرہ سرعام ہوگا، لوگوں کے سامنے ہوگا، بند کمرے میں نہیں۔ اور اس کی براہِ راست ریکارڈنگ بھی ہوگی۔

بہت بہت شکریہ

(۱) اُردو ترجمہ ''اسلام میں خواتین کے حقوق'' کے نام سے دارالنوادر کے زیر اہتمام شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر نائیک کی شہرہ آفاق کتابیں

















